THE DOCTRINE OF MAN.

انسان کیا ہے؟

من تصنیف

پادری ڈبلیو۔آر۔ڈبلیو۔گارڈنر صاحب۔ایم۔اے

Approved by A. C. L. S. M.

By kind permission of the C. L. S.

کرسچن لٹریچر سوسائٹی کی اجازت سے

پنجاب ریلجس بک سوسائٹی۔انارکلی۔لاہور

نے شائع کیا

بار اوّل ۱۹۲۴ (۱۰۰۰)

P. R. B. S. LAHORE.

انسان کیا ہے

پہلا باب

ابتدائے انسان

قرآن کی تعلیم کے مطابق انسان خدا کی آخری اور اشرف صنعت ہے۔ ساری خلقت اس کے ماتحت اور مرضی کے تابع کی گئی۔ "اُسی نے تمہارے لیئے جو کچھ زمین میں ہے خلق کیا" (سورہ بقر ۲-۲۷)۔ اُسی کی خاطر اور اُسی کی ضروریات پوری کرنے اور اُسی کی آسائش کے لیئے اس زمین کو اور جو کچھ اُس میں ہے پیدا کیا۔ اُسی کی خاطر ہوائیں چلتی اور مینہ اسی زمین پر بارش برستی ہے تاکہ زمین سے اپنی موسم پر پھل پیدا ہوں۔ "کیا اُس کو سجدہ نہ دیں جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور جو تمہارے لئے آسمان سے مینہ برساتا ہے جس کے ذریعہ سے ہم نفیس مزے دار پودے پیدا کرتے ہیں" (سورہ نمل ۲۷-۱۶)۔ "اُس کے نشانوں (معجزوں) میں سے ایک یہ ہے، کہ وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے جو (مینہ کی) خوشخبری لاتی ہیں۔ تاکہ ہم تم کو اُس کی رحمت کا مزہ چکھائیں۔ اور اُس کے حکم سے جہاز چلیں تاکہ تم اس کی نعمتوں سے (بذریعہ تجارت) مالدار ہو جاؤ اور اُس کا شکریہ

ادا کرو"۔ (سورہ روم ۳۰-۴۵+ نیز دیکھو سورہ ۱۵-۲۱ و ۲۲+۷-۵۵
۱۱ سے ۱۴+۴۵-۱۲ سے ۸۰+۴۳-۳+۱۵۹-۲+۱۰-۲۶+۴۶-۲۷+۵۰-۲۵+

آدمی کی خاطر بوجھ اُٹھانے والے چوپائے بنائے تاکہ محنت کریں اور اُس کو اور اس کے مال و متاع کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ لے جائیں۔ "خدا ہی نے تمہیں مویشی دیئے تاکہ اُن میں سے بعض پر تم سواری کرو۔۔۔ ۔۔۔تاکہ اُن پر سوار ہو کر دلوں میں جو کام سوچے تھے اُن کو سرانجام دو۔ اور انہیں کے ذریعے تم خشکی کا سفر کرتے ہو اور جہازوں کے ذریعہ تری کا" (سورہ مومن ۴۰-۷۹)۔ "کیا وُہ سوچتے نہیں کہ ہم نے ان کی خاطر جو چیزیں ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائیں مختلف اقسام کے مویشی پیدا کئے۔ جن کے وُہ اب مالک ہیں۔ اور ان کو ہم نے ان کے ماتحت کر دیا؟ تم اُن میں سے بعض سواری کے لئے ہیں۔۔۔۔ (سورۃ یٰسین ۳۶-۷۱+ نیز دیکھو سورہ ۴۳-۶ سے ۱۲)+

فی الواقعہ انسان خدا کا خلیفہ تھا۔ زمین پر اُس کا قائم مقام ہے جو اُس کے ہاتھ کی صنعتوں پر مامور ہوا۔ "جب تیرے خداوند نے فرشتوں سے ک[ہا] مَیں زمین پر ایک خلیفہ مقرر کرنے کو ہوں۔ تو انہوں نے کہا کیا تو ای[سے] شخص کو مامور کرے گا جو زمین میں بدی اور خونریزی کرے گا"؟ (س[ورہ] بقرہ ۲-۲۸)+ اُس کی ذات افواج ملائک سے افضل ہے۔ کیونکہ انسا[ن] کی پیدائش کے وقت اُن کو حکم ہوا کہ اُس کے شرف کو تسلیم کر کے اُس کے آگے سجدہ کریں۔ (دیکھو سورہ ۱۵-۲۶+۷-۱۰+۱۷-۷۲)

لیکن یہیں یہ عظمت اور شرافت بمقابلہ خدا کی دیگر صنعتوں کے بذاتہٖ اس امر کا امکان اپنے اندر رکھتی تھیں کہ وُہ اس اعلیٰ حالت سے گر کر اسفل اور ذلت کی حالت میں جا پڑے۔ جس شخص کے لئے اعلیٰ درجہ تک ترقی کرنے کا امکان ہو اُس کے لئے پستی اور ذلت کا بھی امکان ہے۔ اور فی الحقیقت جو مخلوق خدا کی افضل صنعت ہو اُس کے لئے ادنیٰ سے ادنیٰ ہونے کا امکان ہے اور ایسا وقوع میں بھی آیا۔ اور نا شکر گزاری اور کمینگی کے اسفل السافلین میں گر کر سب سے بڑا عذاب اُٹھائے۔ "بے شک ہم نے انسان کو اعلےٰ طینت سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اُس کو ذلیل سے ذلیل کر دیا سوائے ان کے جو ایمان لاتے اور نیکی کرتے ہیں کیونکہ اُن کو اجر لازوال ملے گا (سورہ التین ۹۵-۴ سے ۶)+

قرآن میں آدم کی تخلیق دو علیحدہ علیحدہ صورتوں پر مشتمل ہے۔ پہلے تو اُس کے بدن کی ساخت ہے۔ اس کو خدا نے زمین کی خاک سے یا گارے سے پیدا کیا جیسے کمہار اپنے برتن بناتا ہے۔ "اُس نے آدم کو مٹی کے برتن کی طرح سوکھے گارے سے پیدا کیا" (سورہ رحمان ۵۵-۱۳)۔ ایسا کرنے میں کونسا طریقہ عمل میں آیا اس کا ذکر نہیں۔ کیونکہ یہ جملہ "مٹی کے برتن کی طرح" تخلیق کے عمل کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ بلکہ اُس کی تکمیل کی طرف۔ اس میں اس امر پر زور ہے کہ انسان اپنی اصل کا فخر نہ کرے۔ جن عناصر سے اُس کا بدن بنا اُن میں کوئی شئے

بذاتِ خود کسی قدر و وقعت کی نہیں اور جو کچھ اُس میں کسی قدر و قیمت کا ہے وُہ دوسرے چشمے سے حاصل ہوا۔

آدمی کے بنانے یا صورت دینے کے طریقے کا کچھ ذکر نہیں آیا اور ہم یہ قیاس نہ کریں کہ اس جملے سے "اُس نے آدم کو سوکھے گارے سے پیدا کیا" محمد صاحب کے دل میں اُس کی تخلیق کے بارے میں کوئی صاف خیال تھا۔ اس میں تو شک نہیں کہ یہ الفاظ استعارہ کے طور پر ہیں۔ اور صرف ایسے الفاظ ہی ہیں خدا کے خالقی کاموں کا بیان ہو سکتا ہے۔ بے جان انسانی بدن خاک میں مل جاتا ہے۔ طبعی نتیجہ یہ ہے کہ جس خاک سے وُہ پیدا ہوا اُسی کی طرف وُہ عود کر جاتا ہے یہ خود بخود نہیں بن گیا۔ یہ خدا کی دستکاری ہے۔ اس لیے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ "اُس نے اسے زمین کی خاک سے بنایا"۔ یا "اُس نے انسان کو مٹی کے برتن کی طرح سوکھے گارے سے پیدا کیا"۔

شروع میں ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے الفاظ کے مطابق لفظ "پیدا کرنے" کے یہ معنی نہیں کہ "نیست سے پیدا کیا"۔ ایسی شئے کو وجود میں لانا جو پہلے اُس صورت میں موجود نہ تھی۔ گو وُہ شئے پہلے سے موجود عناصر سے بنی ہو قرآن کی زبان میں "خلق کرنا" ہے۔

علاوہ ازیں قرآن میں یہ فعل "خلق" خدا کے افعال ظاہر کرنے پر ہی محدود نہیں بلکہ آدمیوں کے افعال و ایجاد پر بھی آتا ہے۔ "کیا تو نے نہیں سوچا کہ خدا نے (قوم) عاد ارم سے کیا سلوک کیا کہ انہوں

نے عالیشان عمارتیں بنوائیں۔ جن کی مانند اس ملک میں کبھی نہ (خلق) بنی تھیں"؟ (سورہ فجر ۸۹-۵ سے ۷)۔ پہلے سے موجود مسالے سے عمارت بنانا بھی "خلق کرنا" کہلایا۔ بلکہ استعارے کے طور پر کسی انسان کے دل میں کسی خیال کا پیدا ہونا بھی "خلق کرنا" کہلاتا ہے۔ "تم خدا کے سوا صرف بتوں کی پرستش کرتے ہو اور جھوٹ بناتے (خلق کرتے) ہو"۔ (سورہ عنکبوت ۲۹-۱۶)۔ الغرض قرآن میں لفظ "خلق کرنے" سے نیست سے ہست کرنا مراد نہیں۔ بلکہ لفظ "اَنشا" ایسے موقعوں پر استعمال ہوا ہے جہاں ہمیں لفظ "خلق" کی توقع تھی۔ مثلاً سورہ یٰسین ۳۶-۷۹ میں یہ آیا ہے۔ "جس نے اُن کو اول بار پیدا (اَنشاھا) کیا تھا۔ وہی ان کو جلائے گا۔ اور وُہ سب پیدا (خلق) کرنا جانتا ہے"! اس کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ قرآن کے بہت مقامات میں انسان کی پیدائش کا ذکر قیامت کے قرینے میں مذکور ہے۔ جو ایک معنی میں "خلقت ثانی" ہے (دیکھو ۲۲-۵ اور دیگر مقامات کو۔)۔

"خلقت" کا یہ تصور اور خلق کرنے کے یہ معنی قرآن کا مطالعہ کرتے وقت یاد رکھیں جہاں کہ خدا اور اس جہان کے تعلق کا ذکر آیا ہے۔ قرآن میں اس لفظ اور اس کے مشتق الفاظ کے بارہ میں اس عدم امتیاز کی وجہ سے محمدی علماء اور محمدی مذہب کے متعلق مغربی مصنفوں نے بہت مغالطے کھائے۔

علاوہ ازیں "خلقت" کا تصور جو قرآن میں پایا جاتا ہے۔ وہ وسائل

اور اسباب کے منافی نہیں۔ جب خدا کے افعال کا بیان کرنے کے لئے یہ لفظ آیا تو اُس کے یہ معنی ہیں کہ قادر مطلق ارادے نے ہمہ دان علم کی مدد سے ایک فعل کو تکمیل تک پہنچایا۔ اور اہل اسلام کی نظر میں قادر مطلق ارادہ کی تعمیل بذریعہ وسائل اور اسباب کے اُس فعل کی عظمت و شان کو کسی طرح گھٹاتی نہیں۔ اور نہ اُس کے وقوع پانے کے نامعلوم طریقے سے اُس میں فرق آتا ہے۔ جس کے ذریعہ انسان کی عقل جب اُس کے نتیجے پر غور کرتی ہے تو حیران ہو کر اپنا عجز ظاہر کرتی ہے۔

نوع انسان کے افراد کی پیدائش کے بارہ میں قرآن کی جو تعلیم ہے اُس کے مطالعہ کے نتائج کو ہم کچھ قبل از وقت پیش کر رہے ہیں۔ مگر جو کچھ ہم کہہ چکے اس کی کلی تصدیق اُن مقامات سے ہو جائے گی جو اولاد آدم کی پیدائش کے متعلق ہیں۔

بادی النظر میں شاید کوئی یہ خیال کرے کہ ایسے مقامات مثلاً سورہ آل عمران ۳-۴۷ یا سورہ قمر ۵۴-۴۹ خلقت کے اس تصور کے خلاف ہیں۔ ان میں سے پہلے مقام میں یہ ترجمہ آیا ہے۔ "اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب وہ کسی کام کا کرنا ٹھان لیتا ہے تو بس اُسے فرما دیتا ہے کہ ہو اور وہ ہو جاتا ہے"۔ دوسرے مقام میں آیت کا ترجمہ یہ ہے۔ "ہم نے تمام چیزوں کو ایک اندازے کے ساتھ پیدا (خلق) کیا اور ہمارا کام تو بس ایک بات ہوتی ہے جیسے آنکھ کا جھپکانا"۔ ان آیتوں کے الفاظ بہت کچھ استعارے کے

طور پر مستعمل ہوئے ہیں۔ جو کچھ اُن کے معنی ہوں اُن کی نسبت ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا نے انسانی آواز میں کلام کیا۔ زمخشری نے سورہ ۷-۱۷۱ کی تفسیر میں (جس کو ہم آگے چل کر لکھیں گے) یہ بیان کیا کہ قرآن میں استعارہ بہت عام ہے اور اس کتاب میں ایسے استعارے کی ایک مثال اسی آیت میں پائی جاتی ہے "ہو اور وہ ہو جاتا ہے"۔

ان آیات کا مطالعہ کرنے سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ کسی طرح سے اُن کے معنی یہ نہیں کہ خدا خلق کرنے میں وسائل کو استعمال نہیں کرتا۔ ان آیات میں صرف یہ خیال متصور ہے کہ خلق کرنے میں خدا کے سامنے کوئی مشکل نہیں خواہ انسان کے نزدیک وہ کیسی ہی عجیب معلوم ہو۔ جس شئے کو وہ خلق کرتا ہے اُس کے پورا کرنے میں صرف اتنا ضرور ہے کہ وہ امر کر دے (یعنی اپنے دل میں ٹھان لے) اور اُس کا مقصد فوراً پورا ہونے لگتا ہے۔ اور اسی ایک امر کے وسیلے سے وہ مقصد تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔

پس آدم کی پیدائش اول تو اس پر مشتمل ہے۔ کہ خدا نے آدمی کا بدن زمین کی خاک سے بنایا اور انسانی بدن کی صورت اُس کو دی تو بھی جو بدن اس طرح سے اور ایسی صورت پر بنا اب تک انسان نہ تھا۔ یہ تو صرف انسان کی ایک صورت تھی۔ پہلا قدم تو اُٹھایا گیا لیکن دوسرا اُٹھانا ابھی باقی تھا۔ اور جب تک وہ نہ ہو لے ہم نہیں کہہ سکتے کہ انسان خلق ہوا۔ اس دوسرے قدم کی کیفیت ایسے مقامات کا مطالعہ

کرنے سے ظاہر ہو گی جن میں یسوع کے بچپن کے معجزوں کا ذکر ہے۔ کہ وُہ مٹی سے پرند بنایا کرتے تھے۔ ایسے دو مقام ہیں۔ پہلے مقام میں یہ درج ہے۔ "میں تمہارے لئے مٹی سے پرند کی شکل کا سا جانور بناؤں (اَخلُقُ)۔ پھر اُس میں پھونک ماردوں اور وُہ خدا کے حکم سے اُڑنے لگے" (سورہ آل عمران ۳-۴۳)۔ دوسرے مقام میں یہ آیا ہے۔ "اور جب کہ تم میرے حکم سے پرند کی صورت کی ایک مٹی کی مورت بناتے (تخلُقُ)۔ پھر اُس میں پھونک مار دیتے تو وُہ میرے حکم سے پرند ہو جاتی"۔ (سورہ مائدہ ۵-۱۱۰) + ذی حیات کی خلقت دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بدن تیار کیا جاتا ہے۔ پھر اُس میں پھونک مار کر اُس کو زندگی دی جاتی ہے۔

جس طریقے سے خدا نے انسان کو پیدا کیا تھا۔ اُس کی یہ ایک نقل ہے۔ جب خدا نے انسان کو خلق کیا تھا تو اُس نے اسی طرح کیا تھا۔ اُس نے آدم کے بدن کو سوکھے گارے سے بنایا۔ پھر اُس نے اُس بدن میں اپنی رُوح پھونک دی۔ "اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں کالے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کرنے والا ہوں۔ تو جب میں اُس کو پورا بنا چکوں۔ اور اُس میں اپنی روح پھونک دوں۔ تو تم اُس کے آگے سر بسجود گر پڑنا"۔ (سورہ الحجر ۱۵-۲۶ + نیز دیکھو سورہ اعراف ۷-۱۰) +

ان آیتوں میں اس بات کا ذکر ہے کہ انسان کیسے بتدریج بن گیا

اس عمل میں نہ صرف دو مختلف صورتیں ہیں بلکہ بدن کی ساخت بھی بتدریج عمل میں آئی۔ "اُس کو پورا بنا چکوں"۔ اور اُس وقت تک اُس میں روح نہ پھونکی گئی جب تک کہ بدن پورا نہ بن چکا اور اُس رُوح کے رہنے کا مناسب مسکن نہ ہو گیا جسے وُہ اُس میں پھونکنے پر شروع سے تیار تھا۔

البتہ ہم یہ تو دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ایسے الفاظ استعمال کرتے وقت محمد صاحب کو مسئلہ ارتقا کا خیال تھا۔ تو بھی یہ عیاں ہے اور قابل غور ہے۔ کہ یہ الفاظ مسئلہ ارتقا کے خلاف تو نہیں۔ اور اہل اسلام مسئلہ ارتقا کو مان کر یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ آیت اُس کے اس دعوی کی تصدیق کرتی ہے۔

انسان کی خلقت میں دوسرا جزو از رُوئے قرآن یہ ہے کہ اُس بدن میں وُہ روح پھونکی گئی جو زمینی نہیں بلکہ خود خالق سے رشتہ رکھتی ہے۔ کیونکہ وُہ وجود پکڑتی اور بدن میں سکونت کرنے لگتی ہے وُہ بدن اب تک صرف انسان کی صورت پر تھا۔ اور پھر خدا نے اس بدن میں الہٰی روح پھونک دی۔ "اور میری روح میں سے اُس میں پھونکا"۔

یہ تو تحقیق معلوم نہیں ہوا کہ انسان کی پیدائش میں از روئے قرآن کوئی ایسی صورت بھی تھی جس کا ذکر قرآن میں نہیں ہوا۔ خودِ خالق کے اِس پھونکنے سے جو روح انسان کو ملی آیا وُہ جان

سے یعنی اُن کی پیٹھوں سے اُن کی نسلوں کو باہر نکالا اور اُن کے مقابلے میں خود اُن ہی کو گواہ بنایا (اور اُن سے پوچھا) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں ؟ سب بولے ہاں۔ ہم گواہ ہیں۔ (اور یہ اس غرض سے کیا کہ ایسا نہ ہو) کہیں قیامت کے دن تم کہنے لگو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر ہی رہے۔ یا (یعنی کسی نے ہم کو جتایا نہیں)۔ (سورہ اعراف ۷-۱۷۱) + بقول سیل صاحب مفسروں نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ خدا نے آدم کی پیٹھ کو ٹھونکا۔ اور اُس کی پشت سے اُس کی ساری اولاد کو نکالا۔ جو روز قیامت تک دنیا میں پیدا ہونے کو تھی پشت در پشت۔ یہ ساری اولاد مثل چیونٹیوں کے فی الواقعہ جمع تھی۔ اور اُن کو خرد حاصل تھی۔ اور جب انہوں نے فرشتوں کے سامنے خدا پر توکل رکھنے کا اقرار کیا تو انہیں پھر خدا نے آدم کی پشت میں رکھ دیا"۔ سیل صاحب کہتے ہیں کہ اس امر سے یہ ظاہر ہے کہ قبل از دنیا نفوس کی ہستی کے علم سے اہل اسلام ناآشنا نہ تھے"۔

مخفی نہ رہے کہ سیل صاحب نے یہ نہیں کہا کہ قرآن کی یہ تعلیم ہے کہ قبل از دنیا نفوس کا وجود تھا۔ لیکن وُہ صرف اتنا کہنے پر قناعت کرتے ہیں کہ اس تعلیم سے اہل اسلام ناآشنا نہ تھے۔ مگر یہ عبارت بہت مشتبہ سی ہے۔ اور جس قصے کا بیان سیل صاحب نے کیا اُس سے قرآن کی آیت کو تطبیق دینا بہت مشکل ہے۔ قرآن نے یہ ذکر نہیں کیا کہ آدم کی نسل کو بنی آدم کی پشت سے نکالا۔ اور یہ کہنا بھی مشکل

ہے کہ اس عبارت کے ٹھیک معنی کیا ہیں۔ لیکن اس کے معنے خواہ کچھ ہی ہوں یہ مسئلہ زیر بحث میں کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ کیونکہ بہت سے دیگر مقامات میں اس امر کی صاف و صریح تعلیم پائی جاتی ہے۔

ہم اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ از روئے قرآن آدم کی ذات میں جو لطیف عنصر تھا۔ وُہ خدا کے براہ راست امر سے موجود ہوا جس نے آدم کے بدن میں اپنی روح میں سے پھونکا۔ اب ہم یہ بیان کریں گے کہ از روئے قرآن نہ صرف اولاد آدم اس کی طرح خلق ہوئی بلکہ اس کے خلق کرنے میں اس نوع کے سارے افراد میں الٰہی روح اب تک پھونکی جاتی ہے۔

پہلے آدمی اور پہلی عورت کے خلق کرنے کے بعد خدا نے اپنے عمل کے طریقے کو بدل دیا۔ آدم کو اُس نے مٹی سے پیدا کیا اور حوا کو براہ راست آدم سے۔ لیکن اب جس وقت وُہ کسی آدمی کو خلق کرتا ہے وُہ دیگر وسائل کو کام میں لاتا ہے۔ خلق کرنے کا فعل تو جاری ہے لیکن خلق کرنے کا طریقہ بدل گیا ہے۔ "اللہ ہی نے تم کو (پہلے) مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفے سے۔ پھر (مرد عورت بنا کر) تم کو جوڑے جوڑے بنایا۔ اور نہ کسی عورت کو پیٹ رہتا ہے اور نہ (وُہ بچہ) جنتی ہے مگر خدا ہی کے علم سے"۔ (سورہ فاطر ۳۵-۱۲+ نیز دیکھو سورہ ۱۶۵-۴+ ۲۵-۵۶+ ۵۳-۴۶، ۴۶ و۴۷+ ۷۵-۳۷ سے ۳۹+ ۵۶-۵۸ و۵۹)

"اے لوگو۔ اپنے پروردگار سے ڈرو۔ جس نے تم کو تن واحد سے پیدا

کیا۔ اور اُس سے اُس کی بیوی کو پیدا کیا اور اُن دو سے بہت سے مرد و عورت پھیلائے"۔ (سورہ نساء ۴-۱)۔ "جو کچھ بھی خدا نے اُن کے پیٹ میں پیدا کر رکھا ہو اُس کا چھپانا اُن کو جائز نہیں۔ اگر اللہ اور روز آخرت کا یقین رکھتی ہیں" (سورہ بقر ۲-۲۲۸)۔ ان اور ایسے ہی دیگر مقامات سے یہ بخوبی واضح ہے کہ محمد صاحب نے یہ سمجھا کہ اولاد آدم کی خلقت میں خالق عملی حصہ لیتا رہتا ہے۔ مگر براہ راست خاک سے خلق کرنے کی بجائے اُن کی اولاد کے خلق کرنے میں نوع انسان کے موجودہ افراد کی طبعی قوتوں سے کام لیتا ہے۔ اس لئے پہلے والدین کی طرح یہ اولاد بھی خدا کی خلق کردہ ہیں۔

خلقت کے اس دوسرے طریقے میں خدا نے اُس براہ راست خالقہ فعل کو ترک نہیں کر دیا جس کے ذریعہ ہر فرد بشر اُس کے ساتھ رشتہ رکھتا ہے۔ جو اس معمولی طریقہ پیدائش سے بھی خلق کئے جاتے ہیں اُن میں بھی خدا اپنی الٰہی روح پھونک دیتا ہے اور جب تک یہ روح پھونکی نہیں جاتی وُہ فی الواقع انسان نہیں بنتے۔ "اُس نے جو چیز بنائی خوب ہی بنائی۔ اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا پھر (مٹی کے) نچوڑ سے جو ایک حقیر پانی ہے اس کی نسل چلائی پھر اُس کو درست کیا۔ اور اُس میں اپنی روح پھونکی اور تم لوگوں کے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے" (سورہ سجدہ ۳۲-۶)۔ اس عبارت سے سورہ مومنون ۲۳-۱۲ سے ۱۴ کا مقابلہ کریں جس

کا آخری جملہ یہ ہے "پھر ہم ہی نے اُس کو دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا"۔ اس میں غالباً روح کے پھونکے جانے کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعہ وُہ فی الواقع اور فی الحقیقت انسان بن جاتا ہے جو وُہ پہلے نہ تھا۔ (دیکھو سیل صاحب کا قرآن صفحہ ۲۵۷ کا نوٹ)

ہم نے یہ معلوم کر لیا کہ "خلق" کرنے میں خدا وسائل استعمال کرتا ہے۔ انسانی والدین خدا کے ہاتھ میں مثل اوزار کے ہیں لیکن کل کی مانند نہیں۔ جسمانی لحاظ سے اُن میں یگانگت ہے۔ لیکن روحانی لحاظ سے اُن میں ایسی یگانگت نہیں۔ سورہ ۳۲-۶ کے مذکورہ بالا اقتباس سے یہ عیاں ہے۔ محمد صاحب نے ہر فرد روح کو خدا کا پھونکا ہوا دم سمجھا اور خدا کی مخلوق براہ راست۔ اور نہ کسی اور کے معنی ہیں۔ یہ تو صاف ظاہر نہیں کہ خدا اس روح کو کس وقت خلق کرتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش کے وقت یا اُس کے قریب یہ خلق کی جاتی ہے۔ البتہ عربوں میں پیدائش اور خلق کرنے کے لئے جو لفظ آتے ہیں اُن میں امتیاز نہیں پایا جاتا۔ افضل پیرا دبی غالب آتا ہے اور خلق ہونا اور پیدا ہونا مرادف ہو گئے۔ کم از کم یمن میں عربی لڑکے اپنے جنم دن کا ایسا ذکر کرتے ہیں کہ گویا وُہ ان کے خلق ہونے کا دن ہے۔ جیسے دیگر ممالک میں لوگ اپنی پیدائش کے دن کا ذکر کرتے ہیں۔ الغرض وُہ خلق کئے جانے اور پیدا ہونے میں امتیاز نہیں کرتے۔

اسی طرح قرآن میں بھی طبعی پیدائش کو ویسا ہی خدا کا عمل سمجھا گیا۔ جیسے اس کا روح کو براہ راست پیدا کرنا۔ اور اس لئے از روئے قرآن جب خدا آدمی کو خلق کرتا ہے۔ وہ وسائل کے ذریعے کرتا ہے اور یہ سب کچھ اُس کے ایک لفظ کُنؔ سے ہو جاتا ہے۔ خلق کرنے کا یہ فعل۔ نوع انسان کے افراد کی پیدائش کے معاملے میں خدائی مرضی کی تکمیل۔ زمان و مکان میں اُن وسائل کے ذریعہ سے عمل میں آتا ہے۔ جن کو اُس کی حکمت استعمال کرنا مناسب سمجھتی ہے۔ اور اب بھی جب کبھی وہ آدمی کو خلق کرتا ہے تو وہ سارے مختلف انقلاب اور پیدائش سے پیشتر کے مختلف منازل اُسی حکم "کُن" کی تاثیر سے باقاعدہ عمل میں آتے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ لفظ "کُن" الٰہی ارادہ کا اظہار اور اُس کی مرضی کا بیان ہے۔ اس امر کو ثابت کرنے کے لئے کہ قرآن میں طبعی پیدائش خدا کا فعلِ خالقہ سمجھا جاتا ہے اگر مزید آیات کی ضرورت ہو تو یہ آیت کافی ہوگی "وہی تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں (بتدریج) ایک طرح کے بعد دوسری طرح تین اندھیروں میں بناتا ہے" (سورہ الزمر ۳۹-۸) +

الغرض قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ خدا نے آدم کے بدن کو بنایا۔ اور اُس میں اپنی روح میں سے پھونکا۔ جس کی وجہ سے آدم فی الحقیقت انسان بن گیا۔ اور ویسے ہی ایک دوسرے عمل کے ذریعے اُس نے آدم کی اولاد کے بدنوں کو بنایا اور اُن میں بھی اپنی روح کو پھونکا۔ اور

یوں وہ بھی زندہ انسانی وجود بن گئے۔

آدمی کی پیدائش کے بارے میں قرآن کی تعلیم کو "خلقیہ" (Creationism) کہہ سکتے ہیں بمقابلہ "موروثیہ" (Traducianism) کے اور اُس رائے کے جو ارواح کی ماقبل ہستی کو مانتے ہیں۔ اب ہم اس امر پر غور کریں گے کہ قرآن کی اس تعلیم کا تعلق انسانی ذات کی اخلاقی ذات اور خواص سے کیا ہے۔ خاصکر اس امر پر کہ گناہ کے مسئلہ کے ساتھ اور ہر طرح کی پیدائش کے ساتھ کیا ہے

یہ سوال ایسا نہیں جس پر اہل اسلام نے بہت غور و فکر کیا ہو۔ اُنہوں نے اس کی کافی تشریح نہیں کی اور نہ وضاحت کے ساتھ اُس کو بیان کیا۔ تو بھی قرآنی تعلیم کے مطالعے کے شروع میں یہ مسئلہ آتا ہے اور اُس کے تسلیم کرنے کے نتائج اسلامی علمی کتابوں میں پائے جاتے ہیں

الانسانیت فی الواقعہ اور فی الذات واحد نہیں۔ بلکہ نفس الامر میں انسانیت کوئی شے نہیں۔ صرف نوع انسان ہے اور اُس نوع کی حقیقی یگانگت اُس کی جسمانیت میں پائی جاتی ہے۔ نوع انسان کے بے شمار افراد کے بدنوں میں کچھ مشترکہ شے ہے کیونکہ وہ سب آدم سے نکلے ہیں۔ لیکن ہر فرد روح خدا کا براہ راست مخلوق ہے۔ جو خدا کے فعل کے ذریعے سے اُس بدن میں رکھی گئی جو پہلے والدین سے ملا تھا۔

اس مشترکہ جزو کو بعض اوقات خلق کرنے کا عمل کہا گیا لیکن

یہ براہ راست نہیں۔ بلکہ اُسی معنی میں جس میں کہ ہر ایک بیج کا اُگنا اور ہر پھلدار درخت کا کلیانا اور پھل لانا خدا کے فعل ہیں۔

یہاں تک تو ہم نے خلقت کے بارہ میں قرآن کی تعلیم سے دکھایا کہ نوع انسان کی ابتدا کیسے ہوئی اور اُس نوع کے افراد کا آغاز کس طرح ہوا۔ البتہ اس کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وُہ بھی بڑا اہم پہلو ہے۔ یعنی قرآن کی تعلیم در بارہ پیدائش یا خلقت عامہ کے۔ لیکن اُس کا ذکر اُس موقعہ پر آئے گا جب خدا کے مسئلہ۔ اور دُنیا کے ساتھ اُس کے رشتے کا ذکر ہوگا۔

دوسرا باب

انسان کی فطرت

انسان کی ابتدا کا ذکر تو ہو چکا۔ اب ہم یہ دریافت کریں کہ اُس فطرت انسانی کے اخلاقی صفات اور خواص کونسے ہیں۔

ایسے مقامات پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں جن میں انسان کی حالت کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورہ بلد ۹۰-۴۔ جہاں یہ لکھا ہے۔ "ہم نے انسان کو مصیبت میں پیدا کیا"۔ یہ "مصیبت" طبعی حالت ہے نہ اخلاقی۔ گو لفظوں میں یہ بیان ہے کہ وُہ ایسی حالت میں خلق کیا گیا۔ لیکن اُن سے لا کلام یہی مراد ہے کہ اس دنیا میں آدمی کو عموماً یہی تجربہ ملتا ہے کہ وُہ محنت و مشقت کرے۔ جیسا کہ ایوب ۵-۷ میں لکھا ہے "آدمی تکلیف کے لئے پیدا ہوتا ہے جس طرح سے چنگاریاں اوپر کو اُڑ جاتیں"۔

بعض دیگر مقامات بھی ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت نہیں مثلاً جن میں انسان کی تعجیل اور زود رنجی کے مزاج کا ذکر ہے "انسان بڑا ہی تھُڑ جیا پیدا کیا گیا ہے" (سورہ معارج ۷۰-۱۹)۔ ایسا ہی سورہ انبیا ۲۱-۳۸ میں ہے کہ "انسان جلد بازی کا بنایا گیا"۔ یہ آیات مضمون زیر بحث سے کچھ علاقہ نہیں رکھتیں۔ اس میں تو کچھ شک نہیں کہ ان میں انسان کے مزاج کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یہ مزاج

عملاً عالمگیر ہے اور اس لئے یہ کہ سکتے ہیں کہ "انسان جلد بازی کا بنایا گیا"۔ تو بھی یہ صفت افراد سے علاقہ رکھتی ہے نہ کہ انسانی فطرت سے جو کہ سب انسانوں میں مشترکہ ہے اس لئے ہم ایسے مقامات سے طرح دیں گے۔

مفصلہ ذیل عبارت زیادہ اہم ہے:-

"اور انسان کی (اور اس ذات کی قسم، جس نے اُس کو ایسا درست بنایا۔ پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (یعنے بدکاری اور پرہیزگاری کی امتیاز کی قوت کہ ایک سے پرہیز کرے اور دوسری کو اختیار کرے) (دونوں باتیں) اُس کو سمجھا دیں۔ جس نے اپنی روح کو پاک کیا وُہ ضرور مراد کو پہنچا اور جس نے اُس کو دبا دیا وُہ ضرور گھاٹے میں ہے" (سورہ شمس ۹۱-۷ سے ۱۰)۔ بیضاوی اور زمخشری دونوں نے اس کی تفسیر ایسی ہی کی ہے جیسے سیل صاحب نے۔ اور اس مقام کے یہی صحیح معنی معلوم ہوتے ہیں۔ ان آیتوں کے یہ معنی نہیں کہ آدمی کے نیک اور بد اعمال دونوں یکساں خدا کی طرف سے ہیں۔ بلکہ یہ تعلیم ہے کہ خدا نے انسان کو فہم عطا کی ہے تا کہ نیکی اور بدی کو پہچانے۔ اور یہ قابلیت بخشی تا کہ وُہ ان میں سے جس کو چاہے اختیار کرے۔ اس مضمون کے بارہ میں زمخشری نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس آیت کے الفاظ کا مطلقاً یہی تقاضا ہے کہ اس کی یہی تفسیر کی جائے۔

پس انسان کو محض اخلاقی امتیاز ہی حاصل نہیں کہ وہ نیک و بد کو پہچان لے بلکہ اُسے فعل مختاری بھی حاصل ہے کہ ان میں سے جسے چاہے چُن لے۔ اور اسی چن لینے پر اُس کی خوشحالی یا مصیبت کا دارومدار ہے۔ "جس نے اپنی روح کو پاک کیا وُہ ضرور مراد کو پہنچا اور جس نے اُس کو دبا دیا وُہ ضرور گھاٹے میں ہے"۔ فعل مختاری کے بارہ میں جو قرآن کی تعلیم ہے اُس کا پھر ذکر ہوگا جب ہم یہ بیان کریں گے کہ خدا کے سامنے انسان کی ذمہ واری کے متعلق محمد صاحب نے کیا سکھایا۔ اس لیئے اس وقت ہم اس مسئلہ کو غور کئے بغیر چھوڑ دیتے ہیں۔

پس چونکہ انسان کو یہ اخلاقی امتیاز حاصل ہے اور نیکی اور بدی کے انتخاب میں اُس کو خاص اختیار حاصل ہے اس لئے دیگر سوال یہ ہے کہ کیا ایسے انتخاب میں اُس کو میلان طبع ہے؟ یا ایک دوسری صورت میں اس سوال کو پیش کر سکتے ہیں۔ کیا انسان کا ارادہ اپنی خلقت یا اپنی ذات ہی میں راست ہے یا بد؟

سورہ نساء ۴-۳۲ میں یہ مرقوم ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيفًا "انسان کمزور پیدا کیا گیا"۔ اس میں نو پیدا بچے کی بدنی کمزوری کا ذکر نہیں کیونکہ اُس میں سے گزر کر وُہ بلوغت کی طاقت کو پہنچ جاتا ہے اور پھر بڑھاپے کی کمزوری میں جا پڑتا ہے۔ اس طبعی جسمانی کمزوری کا ذکر دیگر مقامات میں ہوا ہے مثلاً سورہ روم ۳۰-۵۳ "اللہ وُہ ہے جس نے تم

لوگوں کو کمزور حالت سے بنا کھڑا کیا" پھر کمزوری کے بعد توانائی دی۔ پھر توانائی کے بعد کمزوری اور پیری۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

لیکن پہلے حوالے ۴-۳۲ میں روحانی یا اخلاقی کمزوری کا ذکر ہے اور اُس آیت کی یہ تعلیم ہے کہ انسان بذات خود۔ خدا کے براہ راست فعل خالقہ ہی سے اخلاقاً کمزور ہے۔ لیکن انسان کی ذات یا فطرت کے کمزور ہونے سے یہ مراد نہیں کہ وہ گناہ آلودہ ہے۔ اس مابعد جملے سے یہ مراد ہے کہ اس کی فطرت میں بدی کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ مسیحی دین کی یہ تعلیم ہے کہ بدی کی طرف یہ میلان آدمی کی افتادگی کا نتیجہ ہے جس کا اثر انسانی ذات پر ہوا جو شروع میں پاک اور راست خلق ہوئی تھی۔ لیکن آدم کے گناہ کے بعد نوع انسان اس گناہ آلودہ یا بگڑی حالت کو میراث میں پاتے ہیں۔ قرآن نے اس حد تک تو بیان نہیں کیا۔ بلکہ انسانی فطرت کی حقیقت کی تفتیش میں اُس نے ایک اور طریقہ اختیار کیا اور مختلف نتیجہ نکالا اور یہ کہا کہ انسان کمزور مخلوق ہوا۔

اب ہم ان مقامات پر تفصیل وار غور کریں گے۔ جن میں روح یا نفس (Soul) کا ذکر آتا ہے۔ اور یہ دریافت کرنے کی کوشش کریں گے کہ آیا قرآن میں اس نفس (Soul) کی کمزوری یا بگاڑ کا کچھ ذکر پایا جاتا ہے یا نہیں۔ ان مقامات پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "نفس" بہت مختلف معنوں میں مستعمل ہے۔ اِس لئے ہم ہمیشہ

یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ جو کچھ نفس کے بارہ میں یہاں آیا وہ انسانی فطرت میں اخلاقی یا روحانی عنصر کے بارے میں ہے۔

بعض اوقات تو یہ لفظ محض تاکید کے لئے استعمال ہوا یعنی اس امر کے ظاہر کرنے کے لئے کہ خود میں نے یا خود اُس نے۔ اور انسانی فطرت جن عناصر سے بنی ہے اُن کے درمیان امتیاز کا شمہ تک اس میں نظر نہیں آتا۔ چنانچہ سورہ مائدہ ۵-۲۸ میں یہ ذکر ہے قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي (موسی نے) دعا کی کہ اے میرے پروردگار اپنی ذات خاص اور میرے بھائی کے سوا اور کوئی میرے بس کا نہیں"۔ اس کے سوا سورہ مائدہ ۵-۱۱۶ سے بخوبی روشن ہے کہ لفظ "نفس" وہاں انسانی فطرت کے اجزا کے امتیاز کے لئے مطلقاً استعمال نہیں ہوا۔ "(عیسیٰ) عرض کریں گے کہ (اے پروردگار) تیری ذات پاک ہے مجھ سے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ میں ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھ کو کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے ایسا کہا ہوگا تو میرا کہنا تجھ کو ضرور ہی معلوم ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ تو میرے دل (نفس) کی بات جانتا ہے اور میں تیرے دل (نفس) کی بات نہیں جانتا"۔

بعض اوقات لفظ نفس جان یا زندگی کے معنی میں آیا ہے۔ "ہم نے (توریت میں یہود کو) تحریری حکم دیا تھا کہ جان (اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ) کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ...." (سورہ ۵-۴۹ اور نیز سورہ بقرہ ۲-۵۰)۔

مگر قرآن میں اس لفظ کا زیادہ استعمال کل انسان یا انسانیت کے لئے ہوا ہے بلا لحاظ اس امر کے کہ اُس کی فطرت میں اعلیٰ و ادنیٰ عناصر ہیں۔ چنانچہ ایسے استعمال کی چند مثالیں یہ ہیں:۔ "اے موسیٰ جس طرح تو نے کل ایک شخص (نفساً) کو مار ڈالا" (سورہ قصص ۲۸-۱۹)۔ "تم سب کا پیدا کرنا اور تمہارا اٹھا کھڑا کرنا بس ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص کا (پیدا کرنا اور جلا اٹھانا)۔ (کنفسٍ)۔ (سورہ لقمان ۳۱-۲۷)+ "جس نے تم کو ایک تن واحد (مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ) سے پیدا کیا۔ (سورہ انعام ۶-۹۸)+ "ہر شخص (كُلُّ نَفْسٍ) اپنے اعمال کے بدلے گروی ہے"۔ (سورہ المدثر ۷۴-۳۸)۔ اس آخری عبارت سے بادی النظر میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں انسان اور روح (Soul) کے درمیان امتیاز کیا گیا ہے لیکن ایک دوسری سورہ کی آیت کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ انسانی فطرت کے اعلیٰ و ادنیٰ عناصر کے درمیان فرق کرنے کا اِس میں کچھ ذکر نہیں "ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے" (سورہ طور ۵۲-۲۱ سے مقابلہ کرو)+

اسی طرح جن مقامات میں ذکر ہے کہ ہر نفس موت کا ذائقہ چکھے گا۔ وہاں بھی صاف ہے کہ اُس کے معنی کیا ہیں۔ اس لفظ کے معنی وہاں محض انسان یا شخص ہیں۔ "اور کوئی شخص (وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ) بے حکم خدا مر نہیں سکتا۔ (ہر ایک کی موت کا) وقت مقرر لکھا ہوا ہے"

(سورہ آل عمران ۳-۱۹۳)۔ اور اُسی سورہ کی ۱۸۷ آیت میں یہ آیا ہے "ہر شخص موت کا مزہ چکھنے والا ہے"۔ اور (جو عمل تم لوگ کر رہے ہو) اُن کا پورا پورا بدلہ تو تم کو قیامت ہی کے دن دیا جائے گا۔" الغرض بہت سے ایسے مقامات ہیں جن میں لفظ "نفس" کل انسانی ذات کے لئے استعمال ہوا۔

برعکس اس کے بعض دیگر مقامات ہیں جن میں یہ لفظ کچھ مختلف معنی میں آیا ہے۔ یعنی عقل۔ آرزو اور جذبہ کے ظرف کے معنی میں۔ "یہ لوگ تو بس اٹکل اور اپنی نفسانی خواہشوں (وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ) پر چلتے ہیں" (سورہ نجم ۵۳-۲۳)+ "جس چیز کو اُن کا جی (الانفس) چاہے" (سورہ زخرف ۴۳-۷۱)+ "(سامری نے) جواب دیا کہ مجھے وہ چیز دکھائی دی جو اوروں کو نہیں دکھائی دی کہ میں نے فرشتے کے نقش قدم سے ایک مٹھی بھر لی پھر اُس کو ڈھلے ہوئے بچھڑے میں ڈال دیا۔ اُس وقت میرے دل (نفسی) نے مجھے ایسی ہی صلاح دی" (سورہ طٰہٰ ۲۰-۹۶)۔ اس پر بھی اُس کے "نفس" نے (یعنی قابیل کے) اُس کو اپنے بھائی کے مار ڈالنے پر آمادہ کیا" (سورہ مائدہ ۵-۳۳)۔ "ہم اُس کے دلی خیالات (نفسہ) سے واقف ہیں (سورہ قٓ ۵۰-۱۵)۔ "اپنے جی (فی نفسک) میں گڑگڑا کر اور ڈر کر...... اپنے پروردگار کی یاد کرتے رہو" (سورہ اعراف ۷-۲۰۴)+

معصلہ ذیل مقامات ہیں جہاں لفظ "نفس" استعمال ہوا ہے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہاں اُس سے روح (Soul) مراد ہے یا نہیں۔ "اپنا نامہ اعمال پڑھ لے (بنفسک) اور آج اپنا حساب لینے کے لئے تو آپ ہی بس کرتا ہے" (سورہ بنی اسرائیل ۱۷-۱۵)+ اور جو اپنے پروردگار کے حضور میں کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے "نفس" کو خواہشوں سے روکتا رہا۔ تو اُس کا ٹھکانا بس بہشت۔ (سورہ النزعٰت ۷۹-۴۰)+ "اور دل (بالنفس) کی قسم کھاتے ہیں تاجو ملامت کیا کرتا ہے" (سورۃ القیمۃ ۷۵-۲)+ "اور اپنی نسبت نہیں (نفسی) کہتا کہ میں پاک صاف ہوں۔ کیونکہ نفس تو بدی کے لئے اُبھارتا ہے۔ میرا پروردگار ہی اپنا رحم کرے۔ کچھ شک نہیں کہ میرا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے" (سورہ یوسف ۱۲-۵۳)۔ "اُس ذات (نفس) کی قسم جس نے اُس کو بچھایا اور انسان کی (اور اُس ذات کی قسم جس نے اُس کو ایسا) درست بنایا۔ پھر اُس کی بدکاری اور پرہیزگاری (دونوں باتیں) اُس کو سمجھا دیں" (سورہ شمس ۹۱-۱۰)۔ "اور بخل تو سب ہی کی طبیعت (اَنفُس) میں ہوتا ہے" (سورہ نساء ۴-۱۲۷)+

یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم پچھلے تین مقامات میں کچھ رجحان اس طرف ہے کہ کل انسان ہیں اور اُس میں امتیاز کرے جو اُس میں موجود یا اُس سے علاقہ رکھتا ہے اور جسے "نفس" کہتے ہیں۔

سورہ ۱۲ و ۵۳ میں یہ نفس بدی کی طرف اُبھارتا ہے۔ بیضاوی اور زمخشری دونوں نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ یہ کل نوع انسان پر عائد ہوتا ہے گویا اس کے معنی یہ ہیں کہ "ہر شخص بدی کی طرف مائل ہے" امام غزالی اس "نفس" سے یہاں انسان کی ادنیٰ فطرت مراد لیتے ہیں۔ یعنی انسان کی طبعی حیوانی خواہش۔ اور اس تفسیر کے مطابق یہ بدی کی طرف مائل ہے۔ امام صاحب نے یہاں لفظ "نفس" صوفی معنی میں لیا ہے۔ خواہ کچھ ہی معنی ہوں یہ لفظ ٹھیک اُس معنی میں مستعمل نہیں ہوا جس معنی میں کہ مقدس پولس یا کوئی دیگر مسیحی مصنف استعمال کرتا۔ اس آیت میں جو یہ استثنائیہ جملہ آیا ہے "میرا پروردگار ہی اپنا رحم کرے" اُس سے اِس جملہ کے معنی بہت کچھ بدل جاتے ہیں کیونکہ اس کے معنی مختلف ہو سکتے ہیں اور مفسروں کا اس امر پر اتفاق نہیں کہ اس کے معنی کیا لئے جائیں۔ شاید اس کے یہ معنی ہوں کہ جو خدا کی رحمت کا تجربہ نہیں کر رہے یا جنہوں نے اس کا تجربہ نہیں کیا (قرآن میں لفظ "رحم" کے معنی اکثر وہی ہیں جس کو ہم مسیحی "فضل" کہتے ہیں۔ اور قرآن میں یہ رحم سب کے سامنے پیش کیا جاتا ہے گو سب اُس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے) جو فی الواقعہ بدی کی طرف مائل بیان کئے جاتے ہیں۔ یا بقول امام غزالی جن کو نفس "شدت" سے آزماتا ہے۔ جن کا میلان طبع بدی کی طرف ہے۔

بہرحال اس مقام کے یہ معنی نہیں کہ آدم کے گرنے کے بعد بھی

انسان فطرتاً گناہ آلودہ ہے۔

دوسری آیت (سورہ ۹۱۔ ۷ سے ۱۰) پر نظر ڈالنے سے بھی کچھ پتہ نہیں لگتا جس سے یہ نتیجہ نکال سکیں کہ انسان بالذات گناہ آلود یا بدی کی طرف مائل ہے۔ جیسا اوپر ذکر ہوا (صفحہ ۱۳) اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ انسان کو نیکی اور بدی کے مابین امتیاز کرنے کی قوت حاصل ہے۔ اور یہ قوت بھی کہ وہ خواہ نیکی کو چن لے خواہ بدی کو۔ اور اس انتخاب پر ہی اُس کی خوشحالی یا مصیبت کا انحصار ہے۔

ان تین آیات میں سے آخری میں (سورہ ۴ - ۱۲۷) سیل صاحب نے یہ ترجمہ کیا "آدمیوں کی روحیں طبعاً لالچ کی طرف مائل ہیں" لفظ طبعاً کے ڈالنے سے اس آیت کے معنی بہت کچھ بدل جاتے ہیں اور راڈویل صاحب نے جو لفظ "Prone" استعمال کیا۔ وہ بھی کچھ مبالغہ آمیز ہے۔ قرینے کے لحاظ سے اس آیت کے یہ معنی معلوم ہوتے ہیں کہ لالچ یا بخل نوع انسان کے سامنے سدا ایک آزمائش ہیں۔ اس لئے انسانی روح کی طبیعت یا فطرت کا اس میں ذکر نہیں بلکہ لالچ کی خوفناک آزمائش کا۔ جس مقام میں یہ آیت آئی ہے اُس کا بغور مطالعہ کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

یہ کہنا تو دشوار ہے کہ قرآن میں انسانی ذات یا فطرت گناہ آلودہ ہے اگرچہ اُس کی یہ تعلیم بھی ہو کہ آدمی بدی کی طرف راجح ہے (اگرچہ یہ بھی مشتبہ معنی ہیں) یہ رجحان بذات خود گناہ آلود نہیں کہلاتا۔

بلکہ انسانی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ اور جیسا ہم بیان کر آئے ہیں یہ کمزوری انسان کی خلقت میں پائی جاتی ہے۔

برعکس اس کے۔ قرآن نے گو یہ مانا ہے کہ انسان کا ادنےٰ یا حیوانی عنصر بدی کی طرف سخت آزمائش کا باعث ہے۔ تو بھی اُس نے یہ بیان کیا کہ انسانی ذات میں اعلیٰ اشیا کی قابلیت بلکہ میلان طبع ہے۔ چنانچہ ایسے مقامات ہیں جن میں یہ ذکر ہے "تم تو ایک کے ہو کر (اُس کے) دین کی طرف اپنا رُخ کئے رہو یہ خدا کی فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا" (سورہ روم ۳۰-۲۹)۔

اس لئے انسان میں اعلیٰ زندگی کی ایک قابلیت اور میلان ہے۔ یعنی خدا کی عبادت کرنے کا رجحان اور خدا کے بارہ میں کچھ علم رکھنے کی قابلیت۔ یہ قابلیت۔ میلان۔ رجحان اُسے فطرتاً حاصل ہیں۔ وہ اُن کے ساتھ خلق ہوئے۔ اور نوع انسان کی تاریخ میں کوئی ایسا امر واقع نہیں ہوا جس نے اُس کو ان سے محروم کر دیا ہو۔ جب ہم یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں تو غلطی نہیں کرتے کہ وہ اس امر واقعہ کا نتیجہ ہیں کہ خدا نے اپنی روح میں سے انسان میں پھونکی۔

مگر یہ تو مشتبہ بات ہے کہ قرآن نے یہ تعلیم دی کہ خدا نے انسان کو یہ قابلیت عطا کی تھی کہ وہ گناہ کا مرتکب نہ ہو۔ البتہ قرآن کی عام تعلیم یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان خدا کی شفقت

ورحمت کے بغیر پورے طور سے راستباز نہیں ہو سکتا۔ دیکھو سورہ نور ۲۴-۲۱ میں ایمانداروں سے یوں خطاب کیا گیا "اگر تم پر اللہ کا فضل اور اُس کا کرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی پاک نہ ہوتا لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور اللہ (سب کی) سُنتا (سب کچھ) جانتا ہے"۔ لیکن اس کے ٹھیک یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ فطرتاً انسان گناہ ہی کر سکتا ہے اس میں تو صرف یہ تعلیم ہے کہ عملاً معمولاً سارے آدمی گنہگار ہیں۔ کیونکہ اگر سب ایماندار بھی گنہگار ہوں اور سب بے ایمان بھی گنہگار ہوں۔ (اور قرآن کی یہ صاف تعلیم ہے) تو ہم بلا تامل یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اہل کتاب کی یہ تعلیم ہے کہ سارے آدمی گنہگار ہیں۔ مگر قرآن میں ایک مقام ایسا ہے جس میں کسی قدر یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ انسان میں بحیثیت مخلوق ہونے کے گناہ نہ کرنے کی قابلیت ہے۔ چنانچہ سورۃ نساء ۴-۸۵ میں یہ لکھا ہے "اگر تم پر اللہ کا فضل اور اُس کی مہر نہ ہوتی۔ تو چند کے سوا تم (سب کے سب) شیطان کے پیچھے لگ لئے ہوتے"۔ اس آیت کے آخری جملے میں البتہ نیکی کی طرف رجحان اور میلان طبع اور نیکی کے چُننے میں قوت ارادی بعض شخصوں میں ایسی مضبوط ہے کہ خدا کی کسی خاص رحمت کے بغیر وہ شیطان کے حیلوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ تو بھی آیت کے معنی بالکل صاف نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ آیت عام مسئلہ کے سکھانے کے لئے نازل

نہ ہوئی ہو بلکہ کسی خاص موقعہ کی طرف اُس میں اشارہ ہو۔ فی الواقعہ قرآن کی تعلیم بحیثیت مجموعی اس مسئلہ کے بارہ میں بہت صفائی اور صراحت سے بیان نہیں ہوئی۔

فی الحقیقت اس کے بارہ میں قرآن کی یہ تعلیم ہے کہ انسان اس میلان طبع کے ساتھ خلق ہوا کہ وہ خدا کی عبادت کرے اور ایسا کرنے کے لئے اُسے اُس طرف رجحان بھی ہو۔ لیکن پھر بھی ایسی اخلاقی کمزوری کے ساتھ کہ وہ ناقص طور سے اس پر عمل کر سکتا ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً ضرور گرے گا۔ کیونکہ جو اعلیٰ عنصر خدا نے اُس میں پھونکا تھا وہ ضعیف و کمزور تھا۔ وہ ضعف و کمزوری بذات خود نفس یا روح میں تو نہ تھی بلکہ اس میں تھی کہ جو ادنیٰ ذات اُسے بابا آدم سے میراث میں ملی تھی۔ اُس پر قابو رکھنے کے لئے اُس کی قوت ارادی محدود تھی۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اس امر میں قرآن کی تعلیم مسیحی مقدس کتابوں سے مختلف ہے۔ ان مسیحی مقدس کتابوں کے رُو سے انسان کی ساری فطرت نے آدم کے گرنے سے نقصان اُٹھایا۔ اور نیکی کرنے کے لئے ارادے کی کمزوری اُسی گرنے کے نتائج میں سے ایک ہے۔ قرآن کے رُو سے آدمی کی اخلاقی فطرت آدم کے گناہ کے باعث نہیں بگڑی بلکہ وہ فطرتاً کمزور ہے۔

اب ہم اس مضمون پر ایک دوسرے پہلو سے نظر ڈالیں گے اور دریافت کریں گے کہ قرآن میں آدم کی خطا اور اُفتادگی کے

بارہ میں کیا تعلیم ہے؟

اس کتاب میں آدم کی اُفتادگی کا جو بیان آیا ہے اُس سے بہت تو معلوم نہیں ہو سکتا۔ یہ بہت مجمل اور بے تفصیل ہے۔ سورہ بقر ۲-۳۴ سے ۳۷ میں یہ بیان ہے:۔ "ہم نے (آدم سے) کہا۔ اے آدم تو اور تیری بیوی بہشت میں رہو۔ اور اس میں جہاں کہیں سے تیرا جی چاہے بافراغت کھاؤ۔ مگر اس درخت کے پاس مت پھٹکنا۔ (ایسا کرو گے) تو تم اپنا نقصان کر لو گے۔ پس شیطان نے اُن کو وہاں سے اُکھاڑ دیا۔ اور (آخر کار) جس (مزے) میں تھے اُس سے اُن کو نکلوا چھوڑا اور ہم نے حکم دیا کہ تم اُتر جاؤ۔ تم ایک کے دشمن ایک۔ اور زمین میں تمہارے لئے ایک وقت تک ٹھکانا اور ساز و سامان ہے ٥ پھر آدم نے پروردگار سے (معذرت کے چند) الفاظ سیکھ لئے۔ اور خدا نے اُن کی توبہ قبول کر لی بیشک وُہ بڑا ہی درگزر کرنے والا مہربان ہے۔ (جب) ہم نے حکم دیا کہ تم سب یہاں سے اُتر جاؤ تو اگر ہماری طرف سے تم لوگوں کے پاس کوئی ہدایت پہنچے تو (اُس پر چلنا کیونکہ) جو لوگ نافرمانی کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وُہی دوزخی ہوں گے اور وُہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے"۔ سورۃ الاعراف میں یہ قصہ کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے اور اُس آزمائش کا کچھ زیادہ ذکر ہے۔ آدم کی افتادگی کے بیان پر غور کرنے میں اس وقت ہماری منشا یہ بتانا

ہے کہ اس افتادگی کا اثر انسان کی فطرت پر کیا پڑا۔ اور اس امر کو نظر انداز کریں گے کہ اس افتادگی سے انسان اور خدا کے رشتے پر کیا اثر ہوا۔ البتہ اس سوال کے دو پہلو یہ ہیں جو آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہیں تو بھی وُہ واحد نہیں۔ اس افتادگی کا جو اثر خدا اور انسان کے درمیانی رشتہ پر ہوا اُس کو یہاں اس لئے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کیونکہ جب ہم گناہ اور نجات کے متعلق قرآن کی تعلیم کا ذکر کریں گے اُس وقت اُس کا زیادہ مفصل بیان ہوگا۔ اس وقت ہم صرف یہ بیان کریں گے کہ انسانی فطرت پر اس افتادگی کا کیا اثر ہوا۔ اور اس کا بیان کرتے وقت ہم افتادگی کی حقیقت و کیفیت کا مفصل ذکر نہ کریں گے۔ ہم صرف اتنا ہی مان لیں گے کہ افتادگی از روئے قرآن ایک امر واقعہ ہے۔ اور یہ دریافت نہ کریں گے کہ اس میں گناہ کیا تھا۔ بلکہ یہ دیکھیں گے کہ محمد صاحب نے آدم کی ذات پر اور عموماً نوع انسان کی ذات پر اس افتادگی کے اثر کے بارہ میں کیا سمجھا۔

اوّل تو یہ یاد رکھیں کہ یہ آزمائش خارج سے آئی نہ انسانی ذات کے بطون سے۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ "شیطان نے دونوں کو بہکایا" جو اُن کا سخت دشمن تھا اور جس کے بارے میں خدا نے اُس کو خاص آگاہی دی تھی (سورہ الاعراف ۷-۲۱)۔ اس افتادگی کا یہ نتیجہ ہوا کہ باغ عدن اُن سے چھن گیا اور نوع انسان کے افراد کے درمیان دشمنی پڑ گئی

"اُتر جاؤ تم میں سے ایک کا دشمن ایک"۔ باغ عدن کے چھن جانے سے خدا کی مہربانی بھی اُن سے جاتی رہی ہے۔ اس لئے آدمی کو اس امر کی ضرورت پڑی کہ توبہ کے الفاظ اُسے سکھائے جائیں تاکہ وہ مقبول ہو کر پھر خدا کے سامنے حاضر ہو سکے۔ لیکن جہاں اُس نے توبہ کے الفاظ کہے وہ مقبول نظر ہو گیا گو باغ عدن کی خوشحالی اُسے پھر نصیب نہ ہوئی۔

اس تحقیقات کے لئے اس بیان میں قابل غور امر یہ ہے کہ جب خدا نے آدم اور حوّا کو اُن کی نافرمانی کے باعث ملامت کی تو انہوں نے یہ کہا "اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے تئیں آپ تباہ کیا اگر تو ہمیں معاف نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم بالکل برباد ہو جائیں گے" (سورہ الاعراف ۷۔ ۲۲)۔ اُن کا گناہ اُن کو محسوس ہوا۔ البتہ یہ گناہ خدا کے خلاف نہیں بلکہ اُن کے اپنے خلاف ہے۔ وہ بیوقوفی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی خوش حالی کا موقعہ کھو دیا۔ جو کچھ انہوں نے کھویا تھا اُس کا رنج اُن کے دلوں میں سب سے زیادہ ہے اور اس کا کچھ خیال نہیں کہ انہوں نے کس طرح سے قدوس خدا کو ناراض اور غصے کیا۔

یہ تو سچ ہے کہ اُن کو اس تعلیم کی ضرورت پڑی کہ معافی کے مناسب اور شایاں الفاظ کوئی انہیں سکھائے تاکہ اُن کے مطابق وہ معافی مانگیں۔

چنانچہ آدم کو ایسے الفاظ سکھائے گئے۔ لیکن اس کا کچھ ذکر نہیں کہ اس افتادگی کے ذریعہ سے انسانی فطرت نے کوئی ایسی شئے کھو دی جو اُسے پہلے حاصل تھی۔ اُن کی "توبہ" اُن ہی کی طرف سے ہے اور تعلیم کی یہ ضرورت وہ محسوس نہیں کرتے کہ وہ اپنے گناہ کی شدت کو سمجھیں بلکہ یہ کہ کوئی مناسب دُعا اُن کو سکھائی جائے جس کے ذریعے سے وہ معافی طلب کریں۔

اس مقررہ دعا کے سکھائے جانے کے علاوہ وہ خدا سے ہدایت مانگتے ہیں۔ اس کے یہ معنی معلوم ہوتے ہیں کہ اُن کو مزید تعلیم ملے کہ وہ کیسے اُس خوشحالی کو دوبارہ حاصل کریں۔ لفظ "ہدایت" میں ایمان اور اعمال کے متعلق تعلیم شامل ہے۔ اُن کو اس امر کے جاننے کی ضرورت تھی کہ خدا کے بارے میں وہ کیا ایمان رکھیں اور اُس کو خوش کرنے کے لئے وہ کیا عمل کریں۔ ان کے متعلق قرآن کی یہ تعلیم معلوم ہوتی ہے کہ انسان کو فضل کی ضرورت ہے تاکہ اُس کا ایمان محض یہی نہ ہو کہ چند مسئلوں کو عقل سے قبول کرلے بلکہ وہ شخصی تجربہ ہو اور فرائض کا ادا کرنا محض ظاہری عمل نہ ہو بلکہ روح کی باطنی تمنّا۔

لیکن قرآن میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ یہ دُہری ضرورت افتادگی کا نتیجہ ہے۔ جس افتادگی نے کسی طرح سے انسانی ذات کو بگاڑا اور خراب کیا ہے بلکہ خلق ہونے ہی سے انسانی ذات میں یہ متمکن ہے۔

نفس الامر میں محمد صاحب نے یہ نہیں سمجھا کہ یہ پہلی خطا انسانی فطرت کے لئے نتائج سے پُر تھی۔ انسانی فطرت کو کوئی نقصان نہ پہنچا تھا اس لئے آدم کو محض توبہ کافی تھی تاکہ وُہ ازسرِنو خدا کا مقبولِ نظر ہو۔ جیسے آدم کے لئے اِس افتادگی کا اثر بربادکن نہ تھا ویسے ہی اولاد آدم کے لئے بھی۔

ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن میں انسانی ارواح کی پیدائش کا کیا بیان آیا ہے۔ اُس کے مطابق نوع انسان کے پہلے والدین کے گناہ کا کوئی بہت بڑا اثر انسانی ذات پر نہیں پڑا۔ اُنہوں نے گناہ کیا اور اُن سے اور اُن کی اولاد سے باغ عدن کی خوشحالی اور خُدا کی منظورِ نظری چھن گئی لیکن ازروئے قرآن اس کا کچھ ذکر نہیں کہ اُن کے گناہ کی وجہ سے انسانی فطرت کو نقصان پہنچا۔

ہر فرد روح ہر فرد انسان کی پیدائش کے وقت جب خدا کے ہاتھوں سے نکلتی ہے وُہ ہر طرح کی آلائش سے پاک ہوتی ہے۔ وُہ ایسے بدن میں رکھی جاتی ہے جس کو بدی کے میلان اور شہوات ورثے میں ملے ہیں۔ چونکہ طبعی زندگی۔ جو روح سے متفرق و ممیز ہے یعنی ایسی زندگی جو سارے حیوانوں میں پائی جاتی ہے آدم کے اس گناہ کے اثر کو محسوس کرتی ہے اور روح جو اُس کی رُوح میں۔ انسانی حیوان میں پھونکی جاتی ہے وُہ اس زمین پر زندگی کے شروع ہی سے خسارے میں رہتی ہے اور اُس کو عمر بھر جذبات نفسانی اور

ادنیٰ خواہشات سے کم و بیش جنگ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن کوئی ایسی قصور واری نہیں جس میں کہ کل نوع انسان شریک ہوں۔

زبور نویس کے ان الفاظ کے مطابق "دیکھ میں نے بُرائی میں صورت پکڑی۔ اور گناہ کے ساتھ میری ماں نے مجھے پیٹ میں لیا" (زبور ۵۱-۵) قرآن میں کوئی جملہ نہیں پایا جاتا۔ روح کو شروع ہی سے جسم کے مقابلہ میں سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ نوع انسان کے پہلے والدین کی افتادگی کے ذریعے سے اصلی راستبازی کے کھوئے جانے سے یہ جسم بذات خود گناہ آلود نہیں۔ یہ بھی کچھ مشتبہ امر ہے کہ آیا قرآن جسم کو انسانی ذات کا حقیقی حصہ بھی سمجھتا ہے کہ نہیں۔ یا اُسے محض طبعی بدن یا زندہ کل سے متعلق سمجھتا ہے جس میں وُہ ساری صفات اور میلان پائے جاتے ہیں جن سے انسان کو جنگ کرنا پڑتا ہے۔

لیکن خواہ کچھ ہی ہو قرآن میں یہ تعلیم کہیں پائی نہیں جاتی کہ آدم کی گراوٹ میں نوع انسان کی گراوٹ تھی۔ اُس میں کہیں یہ تسلیم نہیں کیا گیا کہ آدمی گناہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے۔ جب وُہ اپنے پہلے والدین کے نقش قدم پر چل کے خدا کے احکام کے خلاف چلتا ہے تب وُہ فرداً فرداً گنہگار ہو جاتا ہے۔

انسان کی فطرت کے بارہ میں یہ رائے کہاں تک دیگر مسائل مثلاً گناہ اور رجحان پر اثر ڈالتی ہے قرآن کی تعلیم کا مطالعہ کرنے سے بخوبی ظاہر ہے۔

تیسرا باب

انسان کی پیدائش کا مقصد
اور
اُس کا رشتہ خدا اور اُس کے ارادے سے

از روئے قرآن انسان کے پیدا کرنے میں خدا کا مقصد کیا تھا؟ اس کے لئے ہم پہلے اس آیت کو پیش کریں گے۔ "ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ اُن میں ہے اُس کو کھیل کے لئے پیدا نہیں کیا" (سورہ انبیاء ۲۱-۱۶) نیز مقابلہ کرو سورہ ۴۴-۳۸ + ۳۸-۲۶ - ۳-۱۸۸ سے۔

دنیا کے خلق کرنے میں خدا نے اپنی ہمہ دانی حکمت سے کام لیا۔ اور جو کچھ اُس نے پیدا کیا اُس میں اُس کا کچھ مقصد تھا۔ دُنیا کی پیدائش محض ایک وہم یا ایک سرسری خیال نہ تھا۔ بلکہ الٰہی تجویز ازل سے موجود تھی۔ انسان اور خدا کے سامنے اُس کی ذمہ واری کے متعلق یہ تصور قرآن نے برابر مدنظر رکھا۔ آدم کی پیدائش سے پیشتر جو کچھ بنا وُہ اس مقصد کی غایت تکمیل کی تیاری تھی اور وُہ مقصد انسان کی پیدائش میں پورا ہوا۔ خلقت کے فطرتی عمل میں انسان ایک اتفاقی مخلوق نہیں یا الٰہی ہمہ دانی کا خودرو نتیجہ نہیں۔ خالق شروع سے جانتا تھا کہ وُہ کس مقصد کے لئے

کام کر رہا تھا۔ اور اپنی حکمت سے اُس نے انسان کو پیدا کیا جو اُس کی مقصد برآری کے لئے مناسب تھا۔ اور اُسے وُہ صفات اور قوائے عطا کئے جن کے ذریعے سے کہ وُہ اپنی ہستی کے مقصد کو پورا کر سکے۔

یہ مقصد اور مدعا کیا تھا۔ اس کا صاف ذکر اس آیت میں آیا ہے "ہم نے جنوں اور آدمیوں کو اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ ہماری عبادت کریں" (سورۃ الذاریات ۵۱-۵۶)۔ انسان کے پیدا کرنے میں خدا کی غرض یہ تھی کہ وُہ اُس کی عبادت کرے اور ایسی عبادت میں وُہ اپنے تئیں پائے۔ عہد عتیق کی تعلیم بھی اس کے مطابق ہے کہ انسان کی حکمت سائنس دانائی اور معلومات عقلی پر مبنی نہیں بلکہ خدا کے خوف پر۔ "خدا سے ڈرنا" اور "خدا کی عبادت کرنا" ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔

پس خدا کا خوف رکھنے یا اُس کی عبادت کرنے کے ذریعے خدا کا وُہ مقصد پورا ہو جاتا ہے جس کے لئے کہ وُہ پیدا ہوا تھا۔

یہ تصور اُن آیات میں بھی پایا جاتا ہے جن میں خدا کے چہرے کا ذکر ہے۔ چنانچہ سورہ بقر میں (۲-۲۷۴) یہ لکھا ہے "تم جو کچھ بھی (خیرات کے طور پر) خرچ کرو گے سو اپنے لئے۔ اور تم تو خدا کے چہرے کے حاصل کرنے کے لئے خرچ کرتے ہو"۔ پھر سورہ رعد ۱۳-۲۲ میں یہ آیا ہے "جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار کی یاد کرتے اور اُسی کی رضامندی (چہرہ) چاہتے ہیں"۔ نیز دیکھو سورہ ۹۲-۲۰ + ۶-۵۲ وغیرہ۔

خدا کی عبادت خواہ عبادت کے چند مقررہ افعال ہوں یا راستباز زندگی یا ایک دوسرے کے ساتھ مروّت کا سلوک ان سب کا چشمہ خدا کی رضا جوئی کی تمنا ہونی چاہیئے۔ یا دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہیں کہ انسان کی کل زندگی ایمان کے لحاظ سے ہو یا عمل کے لحاظ سے وہ اپنے خالق کی مرضی کے مطابق بسر کی جائے اور اُسی کی رضا جوئی ہماری ساری زندگی کا مقصد ہو جن مقامات میں خدا کے چہرے (وجہ اللہ) کی تلاش کرنے کا ذکر ہے اُن میں سے اکثروں میں ہم ہمیشہ یہ نہیں کہ سکتے کہ خدا کے چہرے سے خدا کی تلاش کے سوا کچھ زیادہ معنی ہوں۔ جب کہ خدا کا چہرہ انسان کی طرف ہے اور اُس کی طرف سے ہٹ نہیں گیا۔ عہد عتیق کی اصطلاح میں آدمی خدا کے چہرے کی روشنی کی تلاش کرتے ہیں اور اسی علم و تجربے میں اپنا اجر اور خوشحالی سمجھتے ہیں کہ یہ چہرہ اُن کی طرف متوجہ ہے لیکن جن مقامات میں خدا کے چہرے کا ذکر ہے اُن میں کچھ زیادہ گہرے معنی پائے جاتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اعلے خوشی اور مبارک حالی صرف خدا ہی میں ملتی ہے۔ "اور اللہ ہی کا ہے پورب اور پچھم۔ تو جہاں کہیں منہ کرو اُدھر ہی کو اللہ کا سامنا ہے بے شک اللہ (بڑی) گنجائش والا (اور سب کچھ) جانتا ہے" (سورہ بقرہ ۲-۱۰۹)۔ کل دُعا۔ کل عبادت ان الفاظ میں شامل ہے کہ "خدا کے چہرے کی تلاش" کریں۔ لیکن ان الفاظ

میں کم از کم یہ بھی اشارہ ہے کہ اُس کے چہرے سے خود خدا ہی مراد ہے۔ چنانچہ ان آیات سے یہ اور بھی واضح ہے "اُس کی ذات (وجہ) کے سوائے سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں" (سورہ قصص ۲۸-۸۸) نیز دیکھو سورہ الرحمٰن ۵۵-۲۶۔ جتنی مخلوقات زمین پر ہے سب فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تمہارے پروردگار کی ذات (وَجْهُ رَبِّكَ) باقی رہ جائے گی"۔

لیکن ان الفاظ میں یہ خیال بھی چھپا ہے کہ جن پر خدا کے چہرے کی روشنی پڑے گی وہ بھی امن چین سے رہیں گے۔

خدا کے چہرے کے دیدار کے بارہ میں ہم یہاں کچھ کہنا نہیں چاہتے اس کی نسبت محمدی عالموں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان مقامات کا حوالہ دینے سے ہمارا مدعا یہ تھا کہ ان میں خدا کے چہرے کا جو ذکر ہے اُس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ انسان خدا کی عبادت کے لئے مخلوق ہوا۔ اور اُس کی اعلیٰ خوشی اور خوشحالی اس میں ہے کہ وہ چہرہ اُس کی طرف متوجہ ہے اور اس سے اُس کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور اُس کے دل کی تمنا اور آرزو پوری ہوتی ہے اور اسی غرض سے خدا نے انسان کو پیدا کیا تھا۔

جب خدا نے انسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا تو اُس کو اُس نے محض کَل کی طرح نہیں بنایا کہ جس سے یہ مقصد برابر پورا ہوتا رہے بلکہ خدا کی یہ عبادت جو انسان کی زندگی کا اعلیٰ مقصد

ہے دانستہ اور معقول طور سے عمل میں آنی چاہئے۔ اور اس غرض سے خدا نے اُس کو ادراکِ نفس، خرد اور عقل سے مزین کیا تاکہ بالرضا خدا کی تعظیم و عبادت کرے۔

اس نقطۂ خیال سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو اس زمین پر جو زندگی ملی ہے وہ اس عبادت یا تعظیم کرنے یا نہ کرنے کا موقع ہے۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے پیدا کرنے میں خدا کا مقصد یہ تھا کہ اُس کو آزمائے۔ "ہم نے آدمی کو مرکب نطفے سے پیدا کیا تاکہ اُس کو آزمائیں۔ پھر اسی لئے ہم نے اُس کو سُنتا دیکھتا بنایا" سورہ الانسان (الدہر) ۷۶-۲)۔ البتہ اس کے یہ معنی تو نہیں کہ انسان کو خدا نے محض اس لئے پیدا کیا تاکہ دریافت کرے کہ آیا وہ اس کی عبادت کرے گا یا نہیں۔ بلکہ اُس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے انسان کو اس لئے پیدا کیا تاکہ وہ اُس کی عبادت اور بندگی کریں اور جو تمنائیں اور آرزوئیں اُس کی سرشت میں رکھی تھیں اُن کو پورا کرے۔ اسی وجہ سے اُس کو ایسا پیدا کیا اور ایسی حالت میں رکھا تاکہ اُس کو اُس کی عبادت کرنے یا نہ کرنے کی قابلیت اور موقعہ ملے اور اس معنی میں زمین پر اُس کی زندگی ایک حالتِ آزمائش ہے۔

قرآن میں اس خیال کا اظہار اکثر ہوا اور خاص کر جن مقامات میں مثال کے طور پر یہودی قوم کی تاریخ کی طرف اشارہ ہے۔ مثلاً "اور اللہ نے آسمان اور زمین کو مصلحت سے پیدا کیا ہے اور

مقصود یہ ہے کہ ہر شخص کو اُس کے کئے کا بدلہ دیا جائے۔ اور لوگوں پر کسی طرح کا ظلم نہ کیا جائے گا" (سورۃ الجاثیہ ۴۵-۲۱) "اور ہم نے اُن کو سُکھ اور دُکھ دونوں طرح سے آزمایا" (سورۃ الاعراف ۷-۱۶۷)۔ بعض دیگر مقامات میں بھی یہی خیال پایا جاتا ہے۔

اس سب کے معنی البتہ یہ ہوں گے کہ انسان خدا پر حصر رکھتا ہے اور یہ حصر اس امر سے ظاہر ہے کہ ساری طبعی ضروریات کے لئے انسان کو خدا سے مانگنا پڑتا ہے۔ اور قرآن میں اس کا بہت ذکر آیا ہے۔ لیکن خاص کر انسان کی اخلاقی اور روحانی ضرورتوں کے متعلق قرآن نے انسان کا حصر خدا پر بتایا۔

اس روحانی حصر کے بارے میں (اگر ہم اس کے لئے یہ جملہ استعمال کر سکیں)، قرآن نے برابر یہ تعلیم دی ہے کہ انسان کی ان ضرورتوں کے رفع کرنے کے لئے خدا ہمیشہ سوچتا اور بہم پہنچاتا رہتا ہے۔ چنانچہ یہ تعلیم آئی ہے کہ جب انسان گر گیا اور اُس خوشحالی کے دوبارہ حاصل ہونے کی کچھ امید نہ رہی تو بھی خدا کی محبت اور رحمت نے اُس کو ترک نہ کیا بلکہ اُسے ہدایت اور رہنمائی کا وعدہ کیا جس کے ذریعے سے کہ وہ اپنی پہلی خوشحالی کو دوبارہ حاصل کر سکے۔ "اور ہم نے حکم دیا کہ تم (سب) اُتر جاؤ تو اگر ہماری طرف سے تم لوگوں کے پاس کوئی ہدایت پہنچے تو جو ہماری ہدایت کی پیروی کریں گے اُن پر نہ تو خوف ہوگا اور نہ وہ آزردہ خاطر ہوں گے" (سورہ بقر ۲-۲۶)۔ اس آیت میں یہ تعلیم ہے

کہ خدا کی رحمت اور محبت جس نے اُفتادگی کے باعث نوع انسان کو ترک نہ کیا تھا اُس نے معافی اور دوبارہ منظور نظر ہونے کی اُمید اُن کے سامنے پیش کی۔ لیکن اس امر پر ہم یہاں زور دینا نہیں چاہتے۔ اس آیت کا حوالہ دینے سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ قرآن میں خدا کی رحمت اور محبت کی تعلیم پائی جاتی ہے بلکہ صرف یہ ظاہر کیا چاہتے ہیں کہ اس افتادہ انسان کو کسی نہ کسی طرح سے خدا کے فضل کی مدد درکار تھی اور عام طور پر اب بھی درکار ہے تاکہ وُہ خدا کا پھر منظور نظر بن جائے جس سے کہ گناہ نے اس کو محروم کر دیا تھا۔

علاوہ ازیں قرآن کی تعلیم یہ بھی ہے کہ جو لوگ خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں وُہ اُس حصر کو محسوس اور تسلیم کریں۔ حصر کا یہ احساس اور تسلیم کرنا انسان کے دل میں حقیقی دین کا آغاز ہے۔ اسلام کے قبول کرنے میں پہلا قدم اس امر کا محسوس کرنا ہے کہ ایک واحد سچا خدا ہے اور یہ تسلیم کرنا کہ ہمارا حصر اُسی پر ہے۔ اور یہ عزم کرنا کہ ہم اُسی کو اپنی زندگی کا رہنما بنائیں گے۔ مگر یہ مکمل دین نہیں۔ خدا ہم سے اس سے کچھ بلکہ بہت کچھ۔ زیادہ طلب کرتا ہے۔ وُہ یہ طلب کرتا ہے کہ آدمی یہ سمجھ کر کہ اُس کا حصر سراسر خدا پر ہے اور یہ عزم کر کے کہ وُہ اُسی کی اطاعت کرے گا اُس سے نجات کا طریقہ بھی سیکھے اور عمل کے ذریعے سے اُس کا تجربہ حاصل کرے۔ "عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ اُن سے تو کہہ تم ایمان نہیں لائے۔ ہاں یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے

اور ایمان کا تو ہنوز تمہارے دلوں میں گزر تک بھی نہیں ہوا" (سورۃ الحجرات ۴۹-۱۴)۔ دوسری آیات میں اس امتیاز پر شاید اتنا زور نہیں دیا گیا لیکن یہ ایک ہی آیت اس امتیاز کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔

اگرچہ خدا پر یہ حصر عام ہے اور انسان کی اخلاقی اور طبعی حاجتوں پر محدود نہیں لیکن پھر بھی اُنہی کے متعلق انسان خدا کی ضرورت کو خاص کر محسوس کرتا ہے۔ جس مقصد کے لئے انسان مخلوق ہوا تھا جب وُہ اُس کو پورا کرنے کی سعی کرنے لگتا ہے تو اُس کو خدا کی مدد کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ بغیر خدا اور اُس کے فضل کے انسان اپنے اُن بدطبعی میلانوں پر غالب نہیں آسکتا جن کے ساتھ کہ روح کو اس دنیوی زندگی کے شروع ہی سے سخت جنگ کرنی پڑتی ہے تاکہ وُہ راستبازی اور مبارک آسمانی مکانوں کو حاصل کرے۔ چنانچہ سورۂ نور ۲۴-۲۱ میں یہ آیا ہے "اگر تم پر اللہ کا فضل اور اُس کا کرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی پاک نہ ہوتا"۔ (مقابلہ کرو ۴-۸۵ + ۲-۶۱)۔ چنانچہ جنہوں نے خدا کے فضل اور مدد کا تجربہ کیا ہے اُن کا یہی خیال ہے "خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو اس (بہشت) کا رستہ دکھایا اور اگر خدا ہم کو ہدایت نہ کرتا تو ہم رستہ نہ پاتے" (سورہ الاعراف ۷-۴۳)۔ اُن کو معلوم ہے کہ جو کچھ اُن کو ملا ہے وُہ اُن کے کاموں کا ثواب نہیں بلکہ خدا کی راہ نمائی اور ہدایت کے وسیلے حاصل ہوا۔

اس ہدایت میں نہ محض وُہ علم داخل ہے جو اُس کی مرضی کے مکاشفے سے

حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ تاثیر جو اُن کے دلوں اور عقلوں پر ہوتی ہے تاکہ وہ اُس کی ہدایت کو قبول کریں۔ پس انسان کو خدا کے منور کرنے والے مکاشفے کی ضرورت ہے اور نیز اُس کی ہدایت کی تاکہ وہ شخصی طور پر اس مکاشفے کو قبول کرے اور اپنے دل کو اس کی اطاعت کی طرف مائل کرے۔ یہ سوال کہ "ہدایت" کیا ہے اور اُس سے مراد کیا ہے نجات کے مسئلہ میں مذکور ہوگا۔ ہم یہاں یہ فرض کریں کہ یہ فضل کے ان دونوں وسائل پر مشتمل ہے۔ یعنی اُس کے ارادے کا علم جو اُس کے عطا کردہ مکاشفے کے وسیلے سے حاصل ہوا اور خدا کی ہدایت تاکہ ہم اس مکاشفے کو قبول کریں اور اُس کے مطالبات کو پورا کریں۔

اب ہم یہ بیان کریں گے کہ جس ہدایت اور فضل کی سارے آدمیوں کو ضرورت ہے قرآن میں اُن کا کہاں تک ذکر آیا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو کچھ ضرور ہے وہ مفت اُس کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ چاہے وہ اُسے قبول کرے۔ چاہے اُس کو رد کرے۔ اسی وجہ سے انسان اپنی زندگی کی رفتار اور اپنی روح کی عاقبت کا ذمہ دار ہے۔

انسان کی یہ ذمہ داری قرآن کی خاص تعلیم ہے۔ آئندہ کو ایک دن آرہا ہے جب ہر انسان کو اُس کے آگے اپنے اعمال کا حساب دینا پڑے گا جس نے اُس کو پیدا کیا اور بنایا اور اُس میں اپنے روح میں سے پھونکا۔ اس بیان کے ثبوت میں آیات کا پیش کرنا

ضروری نہیں۔ یہ تعلیم عام ہے اور اسے سب مانتے ہیں۔ جیسے اس تعلیم کا بیان نئے عہد نامے نے کیا ویسے ہی زور و صفائی کے ساتھ قرآن نے بھی کیا کہ موت کے بعد عدالت ہوگی۔

مزید براں اس معاملے میں انسان کی ذمہ داری انفرادی ہے اس بنا پر کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا کہ دوسروں نے اُس کو گمراہ کر دیا یا اُس نے دوسروں کی نصیحت یا نمونے پر عمل کیا۔ "اور (قیامت کے دن) کوئی شخص کسی دوسرے کا بار اپنے اوپر نہیں لے گا۔ اور اگر کسی پر بھاری بوجھ ہو اور وہ اپنا بوجھ ہٹانے کے لیے کسی کو بلائے تو اُس کا ذرا سا بھی بوجھ نہیں ہٹایا جائے گا۔ اگرچہ وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہو" (سورہ فاطر ۳۵-۱۹)۔ قرآن میں مجموعی یا جماعتی نجات کا کچھ ذکر نہیں یا ایسی نجات کا جو قومی برکتوں اور وعدوں کے میراث میں ملنے سے حاصل ہو۔ ہر شخص اپنی ذات سے کھڑا ہوتا یا گرتا ہے۔ ہر شخص اپنے ہی گناہوں اور بے ایمانی کی سزا پائے گا اور ویسے ہی اپنے ہی ایمان اور نیک اعمال کا اجر حاصل کرے گا۔ اور کسی پر ظلم نہ ہوگا +

انسان کی یہ ذمہ داری اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ خدا کی اس پیش کردہ رحمت کو قبول کرنے یا رد کرنے کی قابلیت اُس کو حاصل ہے۔ اس لیے قرآن میں یہ تعلیم صاف طور سے پائی جاتی ہے کہ آدمی کو ان دو میں سے ایک کو قبول کرنے کی طاقت اور موقعہ

حاصل ہے۔ اس میں یہ بیان ہے کہ انسان اپنی زندگی میں جسے اپنا مقصد ٹھیراتا اور جس کی وہ خاص آرزو رکھتا ہے اُس کے چننے کا اُس کو اختیار ہے۔ اور لکھا ہے کہ بعض تو اس دنیا کو پسند کر لیتے ہیں اور بعض آئندہ جہان کو۔ بعض دنیا کی عارضی اور زوال پذیر چیزوں پر دل لگاتے ہیں اور بعض ابدی ازلی اشیا کی تلاش کرتے ہیں۔ "بعض تو تم میں سے دنیا کے پیچھے پڑ گئے اور بعض آخرت کی فکر میں لگے" (سورہ آل عمران ۳-۱۴۶)۔ "جو شخص دنیا کا طالب ہو تو ہم جسے چاہتے ہیں۔ اور جتنا چاہتے ہیں اسی دنیا میں سر دست اُس کو دے دیتے ہیں۔ مگر پھر ہم نے اُس کے لئے دوزخ ٹھیرا رکھی ہے" (سورہ بنی اسرائیل ۱۷-۱۹)۔ "جن کا مطلب دنیا کی زندگی اور دنیاوی رونق ہوتی ہے۔ ہم اُن کے عملوں کا بدلہ دنیا میں اُن کو پورا پورا بھر دیتے ہیں اور وہ دنیا میں گھاٹے میں نہیں رہتے"۔ (سورہ ہود ۱۱-۱۸)۔ "جو کوئی آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اُس کی کھیتی میں اُس کے لئے برکت دیں گے۔ اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم بقدر مناسب اُس کو دنیا کی دیں گے۔ مگر آخرت میں اُس کا کچھ حصہ نہیں" (سورہ الشوریٰ ۴۲-۱۹)۔ "بلکہ انسان چاہتا ہے کہ آگے کو بھی خدا کی نافرمانی کرتا رہے" (سورہ القیمٰة ۷۵-۵)۔ "جو شخص دنیا میں بدلہ چاہتا ہے ہم اُس کو بدلہ یہیں دے دیتے ہیں۔ اور جو آخرت میں بدلہ چاہتا ہے ہم اُس کو وہیں دیں گے۔ اور جو لوگ شکر کرتے ہیں ہم اُن کو

عنقریب جزائے خیر دیں گے"۔ (سورہ آل عمران ۳-۱۳۹)۔ اس قرینے میں ہم سورہ الشمس ۹۱-۷ سے ۱۰ کا پھر اقتباس کرتے ہیں جیسا کہ صفحہ ۲۱ پر کیا تھا "اور انسان کی اور (اُس ذات کی قسم) جس کو اُس نے درست بنایا۔ پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (دونوں باتیں) اُس کو سمجھا دیں۔ غرض ہم کو اُن چیزوں کی قسم جس نے اپنی روح کو پاک کیا۔ وہ ضرور اپنی مراد کو پہنچا اور جس نے اُس کو دبا دیا وہ ضرور گھاٹے میں ہے"۔ نیکی و بدی کے درمیان امتیاز کے علم اور اُن میں سے ایک کو چن لینے کے اختیار کی طرف یہاں اشارہ ہے۔ اور ہر فرد کی عاقبت کا انحصار اس انتخاب پر ہے۔

قرآن نے خدا کے انصاف و عدل کے بارہ میں جو خدا انسان کے ساتھ ہمیشہ برتے گا جو کچھ بیان کیا وہ اس مضمون سے علاقہ رکھتا ہے بار بار یہ جملہ آیا ہے "اور کسی پر ظلم نہ ہوگا"۔ اور محمد صاحب کی زبان سے جیسے یہ الفاظ نکلے ویسے ہی اُن کے معنی ہیں۔ خواہ علما اس کے خلاف کچھ ہی کہیں۔ آدمی اس دنیا میں جیسی زندگی بسر کرتا ہے ویسے ہی اُس کو جزا یا سزا ملتی ہے کیونکہ وہ جوابدہ ہے۔ خدا نے اپنی ہدایت و رہنمائی اُس کے سامنے پیش کی اور اب اُس کا حساب اسی انداز سے ہوگا۔ کہ اُس نے کہاں تک اُن کو قبول یا رد کیا۔

یہ فیصلہ کرنا تو مشکل ہے کہ اس انتخاب میں انسان کہاں تک

مختار ہے۔ اس مسئلہ کے حل کرنے میں قرآن سے مدد نہیں ملتی۔ اس لئے محمدی علما نے تقدیر و فعل مختاری کے بارے میں جو طول طویل بحث کی ہے اُس کا دار و مدار زیادہ قیاس و فلسفے پر ہے نہ الہام و تجربے پر۔ کیونکہ فعل مختاری یا عدم مختاری کے مسئلہ پر انسانی روح روشنی چاہتی ہے۔ اور کچھ مضائقہ نہیں کہ وُہ روشنی کہاں سے ملتی ہے۔

ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ اس مسئلہ کا بیان کرنے میں قرآن سے بہت مدد نہیں ملتی۔ تو بھی لاکلام اُس میں یہ تعلیم پائی جاتی ہے کہ اُس میں ایسی قابلیت اور طاقت ہے جسے ہم ارادہ یا اختیار انتخاب کہتے ہیں۔ وُہ یہ ارادہ کر سکتا ہے کہ فلاں یا فلاں فعل کرے۔ اور جہاں تک وُہ نیکی یا بدی کا ارادہ کرتا ہے وُہ قابلِ تحسین یا قابل نفرین ہے۔ اور یہ کہنا تو بے معنی ہے کہ ارادہ مختار نہیں کیونکہ اُسے صرف چند حدود کے اندر ہی انتخاب کا اختیار ہے اور یہ حدود انسان کی ذات کی ساخت ہی نے اُس پر لاحق کر دی ہیں۔

بلحاظ مذہب کے یہ مسئلہ عملی ہے اور اس لئے عملی پہلو ہی سے اس پر نظر ڈالنی چاہئے۔ بالفرض انسان اپنے ہی طبقے کے اندر فعل مختار ہو۔ اور جس معنی میں خدا خود فعل مختار ہے انسان اُس معنی میں فعل مختار نہ ہو تو بھی اس امر کی کوئی دلیل نہیں کہ انسان محض قسمت کا ایک کھلونا ہے۔

قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ سارا جہان اور انسان جو طبعاً اُس جہان کا ایک جزو ہے وُہ ہمہ دان قادر مطلق خدا کے زیر ہدایت و حکومت ہے لیکن یہ مسئلہ کہ خدا کے احکام مطلق العنان ہیں جیسا کہ اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے قرآن کی یک طرفہ تعلیم ہے اور اُس کی عام تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن نے خدا کے مطلق العنان ہونے اور انسان کے فعل مختار ہونے دونوں پر زور دیا۔ اس لئے جو مسئلہ قرآن کی تعلیم پر مبنی ہو گا وُہ ان دونوں کو تسلیم کرے گا اور ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ رکھے گا۔ وُہ یہ نہ کرے گا کہ ایک تعلیم کو قبول کرے اور دوسری کو رد کر دے۔ اگرچہ انسانی عقل ان دونوں مسائل کو تسلی بخش طریقے سے تطبیق نہ دے سکے۔

ان اوراق میں ہمارا ارادہ ایسی ہی تعلیم کو پیش کرنے کا ہے۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اہل سنت جماعت کا مسئلہ تقدیر یک طرفہ ہے اور قرآن کی تعلیم کا پورا بیان نہیں۔ لیکن اس امر کا مفصل ذکر اُس وقت ہو گا جب خدا اور اُس کے ارادے کے بارہ میں قرآن کی تعلیم پیش کی جائے گی۔ اور اُس موقعہ پر قرآن کی تعلیم کے اس دوسرے پہلو پر غور کیا جائے گا۔

یہاں ہم اس مسئلہ کے انسانی پہلو پر زور دیں گے۔ محمد صاحب نے جو پیغام اپنے ہم وطنوں کو دیا وُہ ان دو باتوں پر مشتمل تھا یعنی امر و نہی پر۔ لیکن ان کا تعلق ہمیشہ اُن کے دل اور ضمیر کے ساتھ تھا اور

اسی لئے اُن سے یہ درخواست کی گئی کہ وُہ نیکی کو قبول کریں اور بدی سے کنارہ کریں۔ "یہ نصیحت کی (باتیں) ہیں تو جو چاہے اپنے پروردگار تک (پہنچنے کا) رستہ اختیار کرے" (سورہ مزمل ۷۳-۱۹)+

آدمی کی ذمہ واری کا یہی خیال جس کا حصر اس پر ہے کہ آدمی اپنے لئے چن لینے کا مختار ہے اکثر قرآن کی اُن آیات میں آیا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ گنہگار یوم عدالت کو طرح طرح کے عذر پیش کریں گے۔ "یہ ظالم اپنے پروردگار کے حضور میں کھڑے کئے جائیں گے اور ایک کی بات ایک رد کر رہا ہوگا کمزور بڑے لوگوں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان لے آئے ہوتے اس پر بڑے لوگ کمزوروں سے کہیں گے کہ تمہارے پاس (خدا کی طرف سے) ہدایت آئی تو کیا اُس کے آئے پیچھے ہم نے تم کو (زبردستی اُس پر (عمل کرنے) سے روکا۔ بلکہ تم خود خطاوار تھے۔ اور کمزور لوگ بڑے لوگوں سے کہیں گے (کہ زبردستی تو نہیں) مگر (ہاں تمہاری) رات دن کی تدبیروں نے (روکا) کہ برابر ہم سے خدا کو نہ ماننے اور اُس کے ساتھ شریک ٹھیرانے کو کہتے رہے"

(سورہ سبا ۳۴ ۳۳-۳۰)+

یہ جملہ کہ "تم خود خطاوار تھے" اس فعل مختاری کا اظہار ہے۔ ایسا ہی سورہ صافات ۳۷-۲۸ سے ۳۱ میں یہ ذکر آیا ہے "ایک فریق دوسرے فریق سے کہے گا کہ تم ہم پر چل چل کر آتے (اور بہکاتے تھے) وُہ کہیں گے (کہ نہیں) بلکہ تم (آپ) ایمان نہیں لائے۔ اور تم

پر ہمارا کچھ زور تو تھا ہی نہیں۔ بلکہ تم خود سرکش لوگ تھے۔ پس ہمارے پروردگار کا وعدہ (عذاب) ہمارے (سب کے) حق میں پورا ہوا۔ تو ہم (سب ہی) کو (عذاب کے) مزے چکھنے ہوں گے۔ ہم (آپ) بہکے ہوئے تھے۔ سو ہم نے تم کو بھی بہکا دیا (مگر بزور نہیں)"۔ نیز دیکھو سورہ ۳۹-۵۸ سے ۶۰ + ۴۳-۱۹ + ۲۵-۱۹ + ۲۰-۱۰۸ +

نئے عہد نامے کی یہ تعلیم ہے کہ خدا ایمان دار کے دل میں نیت اور عمل دونوں کو پیدا کرتا ہے۔ اور مفصلہ ذیل آیات میں محمد صاحب کا پیغام بھی یہی تھا۔ گو الفاظ بہت صاف و صریح نہ ہوں "یہ (باتیں) نصیحت (کی) ہیں۔ تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف (پہنچنے کا) رستہ اختیار کرے۔ اور بے مشیت الٰہی تم لوگ (کوئی بات) چاہ نہیں سکتے ...... جس کو چاہتا ہے رحمت میں داخل کر دیتا ہے۔ اور سرکش لوگوں کے لئے اُس نے عذاب دردناک تیار کر رکھا ہے" (سورہ انسان یا دہر ۷۶-۳۰)۔ "تو جو چاہے اپنے پروردگار کے پاس (اپنا) ٹھکانا بنا رکھے" (سورۃ النبا ۷۸-۳۹)+ "پھر تم (لوگ) کدھر (کو بہکے) چلے جا رہے ہو۔ یہ قرآن تو دنیا جہان کے لوگوں کے لئے نصیحت ہے۔ مگر اُسی کو (مفید ہے) جو تم میں سے سیدھے رستے پر چلنا چاہے۔ اور تم (کچھ بھی) نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے جو تمام جہان کا پروردگار ہے" (سورہ تکویر ۸۱-۲۷ سے ۲۹)+

ہم یہ ذکر کر آئے کہ اس مسئلہ پر مزید غور آگے چل کر ہوگا۔ اِس

وقت اتنا کہنا کافی ہے کہ محمد صاحب نے اس سوال کے ان دو پہلوؤں کو تطبیق دینے کی کوشش نہ کی۔ لیکن اسی پر قناعت کی کہ ایک طرف تو آدمی کی ذمہ واری پر زور دے اور دوسری طرف اس جہان کی پیدائش۔ حکومت اور انتظام میں خدا کے عالمگیر ارادے پر۔ خدا کے قادر مطلق ارادے اور آدمی کی فعل مختاری اور ذمہ واری کو اسی طرح پرانے عہد نامے نے تسلیم کیا اور وہاں بھی اس مسئلہ کے متعلق فلسفیانہ مشکلات کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

اس مسئلہ کے متعلق قرآن کی تعلیم پر غور کرتے وقت ہم اس امر کو نظر انداز نہ کر دیں کہ جن آیات میں انسان کے ارادے کا انحصار خدا کے ارادے پر بیان ہوا وہاں نیکی یا راستی یا صحیح ہدایت کے انتخاب کی طرف اشارہ ہے۔ مجھے قرآن میں اب تک کوئی ایسا مقام نہیں ملا جس میں یہ ذکر ہو کہ بدی کے انتخاب میں انسان کا ارادہ خدا کے ارادے پر منحصر ہے۔ حالانکہ کئی ایسے مقامات ہیں جن میں یہ ذکر آیا ہے کہ جب آدمی بدی کا مرتکب ہوتا یا خدا کی پیش کردہ ہدایت کو رد کرتا ہے اور اپنی خواہشات اور شہوات کی ہدایت قبول کرتا یا شیطان کے خراب وسوسوں پر کان لگاتا یا شیاطین کی سنتا ہے تو وہ آپ ہی ایسا عمل کرتا ہے۔ "اور رہے ثمود۔ تو ہم نے اُن کو (سیدھا) رستہ دکھایا تھا۔ مگر انہوں نے سیدھا رستہ چھوڑ کر گمراہی اختیار کی" (سورہ فصلت ۴۱-۱۶)۔ "یا لگے کہنے کہ اگر مجھ کو (نیک) ہدایت

دیتا۔ تو میں (بھی) پرہیزگاروں میں سے ہوتا یا جب عذاب (سامنے آموجود ہوا اُس) کو دیکھ کر لگے کہنے کہ اے کاش مجھ کو (دنیا میں) پھر لوٹ جانا (نصیب) ہو تو میں (بھی نیک بن کر) نیکوں (کے زمرے) میں رہوں۔ (اُس وقت خدا اُس سے فرمائے گا) ہاں ہمارے احکام تجھ کو پہنچے اور تو نے اُن کو جھٹلایا اور اکڑ بیٹھا اور منکروں میں سے (ایک منکر تو بھی) تھا" سورہ زمر ۳۹-۵۸ سے ۶۰)+ "اور کہتے ہیں کہ رحمٰن چاہتا تو ہم اُن کی پرستش نہ کرتے۔ ان کو اس معاملہ کی کچھ خبر تو ہے نہیں" (سورہ زخرف ۴۳-۱۹)۔ "تو شیطان کہے گا کہ خدا نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا...... تم پر میری کچھ زبردستی تو تھی نہیں۔ بات تو اتنی ہی تھی کہ میں نے تم کو (اپنی طرف) بلایا۔ اور تم نے میرا کہنا مان لیا۔ تو اب مجھے الزام نہ دو۔ بلکہ اپنے تئیں الزام دو" (سورہ ابراہیم ۱۴-۲۶ و ۲۷)۔

یہی تعلیم ٹھیک طور پر اُن آیات سے نکلتی ہے جن میں صاف طور پر یہ بیان آیا ہے کہ جب آدمی گناہ کرتا ہے تو وہ خدا کی ہدایت کی پیروی نہیں کرتا۔ چنانچہ سورہ قصص ۲۸-۵۰ میں یہ لکھا ہے "اگر یہ لوگ تمہارے کہنے کے مطابق نہ کر دکھائیں تو جان لو کہ صرف اپنی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اُس سے بڑھ کر گمراہ کون کہ خدا کی طرف سے تو اس کے پاس ہدایت ہے نہیں۔ بے شک اللہ خودسر لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا" (دیکھو سورہ ۲-۲۶۰ + ۳-۸۰ +

۵-۵۶+ ۶-۱۴۵+ ۹-۱۹ و ۱۱۰+ ۶-۴۶+ ۹-۶۱+ ۷-۶۲+ ۵-۶۲)+

صاف طور سے قرآن کی عام تعلیم یہ ہے کہ خدا سب لوگوں کو دعوت دیتا ہے خواہ کوئی اُسے قبول کرے خواہ رّد کرے۔ "کہہ کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے پس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے۔" (سورہ کہف ۱۸-۲۸)+ خدا کا فضل سب کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور سبھوں کو توبہ کی دعوت دی جاتی ہے۔ لیکن یہ دعوت صرف اُنہیں کے لئے مؤثر ہے جو اس کو قبول کرتے ہیں۔ یہ برگزیدہ لوگ ہیں۔ آدمیوں کے دلوں کے سخت ہونے کا مسئلہ نجات کی اِس عالمگیر دعوت کے ساتھ ساتھ آتا ہے۔ نئے عہدنامے کی طرح قرآن نے بھی اس مسئلہ کا عملی پہلو ہی بیان کیا اور یہ کہا کہ خدا کے فضل کے اس تحفے کو وُہ قبول کر لیتے ہیں اور اپنے دلوں میں جانتے اور محسوس کرتے ہیں کہ جو کچھ وُہ ہیں صرف خدا کی رحمت کے طفیل ہیں اور بغیر اُس کے فضل کے اُن میں اور دوسروں میں کچھ فرق نہ ہوتا۔ وُہ اس لئے خدا کے فضل کو قبول کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے کہ وُہ برگزیدہ لوگ ہیں۔ بلکہ وُہ محسوس کرتے ہیں کہ چونکہ اُنہوں نے اُس فضل کے پیغام کو ماننا اور قبول کرنا چاہا اس لئے وُہ برگزیدہ ہیں "اور بول اُٹھیں گے کہ خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو اس کا رستہ دکھایا۔ اور اگر خدا ہم کو ہدایت نہ کرتا تو ہم (کسی طرح پر جنت کا) رستہ نہ پاتے" (سورہ اعراف ۷-۴۱)+

خدا کے فضل اور ہدایت کے ہدیے میں دُہرا نتیجہ نکلتا ہے کہ اِسے قبول کرنے والے اِسے کیسے قبول کرتے ہیں۔ "کہہ کہ جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اُن کے لئے تو یہ (قرآن سرتاپا) ہدایت اور شفا ہے۔ اور جو ایمان نہیں رکھتے اُن کے کانوں میں گرانی اور وُہ اُن کے حق میں نابینائی ہے۔ یہ لوگ بڑی دور کی جگہ سے پکارے جاتے ہیں" (سورہ فصلت ۴۱-۴۴) "سو جو ایمان رکھتے ہیں اس نے اُن کا تو ایمان بڑھایا اور وُہ خوشیاں مناتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے تو اُس نے اُن کی خباثت پر ایک خباثت اور بڑھائی۔ اور یہ لوگ کفر ہی کی حالت میں مرگئے" (سورہ توبہ ۹-۱۲۵+ نیز دیکھو سورہ ۲-۲۴+ ۱۷-۸۴)+

ہر فردِ بشر کو اس روئے زمین پر ہی موقعہ حاصل ہے کہ خدا کی اس رحمت کو قبول کرے یا رد کرے۔ موت کے بعد کوئی مزید حالتِ آزمائش نہیں۔ جس تعلیم کا ہم ذکر کر آئے ہیں یہ اُس کے عین مطابق ہے کہ اس رُوئے زمین پر آدمی کی زندگی ایک حالتِ آزمائش ہے۔ ہر آزمائش و امتحان کا ایک محدود وقت ہوتا ہے۔ یہ لگاتار ابد تک جاری نہیں رہتا۔ اب نئی بات جو ہم پیش کیا چاہتے ہیں یہ ہے کہ قرآن کے مطابق یہ محدود زمانہ ہر فرد کی موت تک ہی ہے۔ "تو اُس دن نہ تو نافرمانوں کو اُن کی عذر خواہی فائدہ بخشے گی اور نہ اُن کو (خدا کے) راضی کر لینے کا موقعہ دیا جائے گا" (سورہ روم

۳۰-۵۷)۔" تو کہہ کہ جو لوگ (دنیا میں) کفر کرتے رہے۔ فیصلے
کے دن اُن کا ایمان لانا اُن کے کچھ کام بھی نہ آئے گا۔ اور نہ اُن
کو مہلت ہی ملے گی" سورہ سجدہ ۳۲-۲۹ + نیز دیکھو سورہ ۵۷-
۱۴ + ۳۵-۳۴) +

اِن جیسے مقامات سے بخوبی ظاہر ہے کہ قرآن نے آئندہ
حالتِ آزمائش کی کوئی اُمید نہیں دی۔ اور جس مقصد کے لئے خدا
نے انسان کو اس زمین پر پیدا کیا تھا اُس کے یہ عین مطابق ہے:
"جس دن تمہارے پروردگار کے بعض نشان (یعنی قیامت کے
بڑے آثار) ظاہر ہوں گے تو جو شخص اس سے پہلے ایمان نہیں لایا
یا اپنے ایمان (کی حالت) میں اُس نے نیک کام نہیں کئے۔ اب اُس کا
ایمان لانا اس کو کچھ بھی سود مند نہ ہوگا" (سورہ انعام ۶-۱۵۹)۔ آدمی
جو کچھ اس زندگی میں بوتا ہے ویسا ہی وہ عاقبت میں کاٹے گا +

ایک اور بات کا ذکر ہم کریں گے اور قرآن کی تعلیم جو انسان کے بارہ
میں ہے اُس کو ہم ختم کریں گے گو اس کی نسبت اور بھی بہت کچھ لکھا
جا سکتا تھا۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ محمد صاحب نے یہ تسلیم کر لیا کہ دین کی
قابلیت انسان کی سرشت میں تھی اور خدا کو ماننے اور ایک حد تک
خدا کو پہچاننے کی قوت اُس کو حاصل تھی۔ خدا کو ماننے اور پہچاننے
کی قابلیت کی وجہ ہی سے وہ اشرف المخلوقات اور دیگر حیوانات

سے افضل ہے اور اس کا وجود اسی وجہ سے ہوا کہ آدمی کی
پیدایش کے وقت خدا نے اپنی روح میں سے اُس میں پھونک
دیا۔ یہ تو سچ ہے کہ قرآن کے رو سے ساری فطرت اور خلقت
[...] کرتی اور اس کی عبادت کرتی ہے۔ سورہ رعد
۱۳-۱۶ میں آیا ہے۔ "جس قدر مخلوقات آسمان و زمین میں ہے
چار و ناچار الٰہی کے آگے سر بسجود ہیں۔ اور صبح و شام اُن
[...]ائے"۔ اور سورہ نحل ۱۶-۵۰ و ۵۱ میں ہے "کیا اِن
[...]وں نے خدا کی مخلوقات میں سے کسی چیز کی طرف نظر نہیں کی
کہ اس کے سائے کبھی داہنی طرف کو اور کبھی بائیں طرف کو جھکتے
ہوئے" اللہ کے آگے سر بسجود ہیں۔ اور وہ عاجزی کا اظہار کر رہے
[...]ں اور جتنی چیزیں آسمانوں میں اور جتنے جاندار زمین میں ہیں اللہ
[...] کے آگے سر بسجود ہیں"

لیکن فطرت اور ادنیٰ حیوانات کا عبادت کرنا نادانستہ
بلکہ جبریہ ہے۔ آدمی کا درجہ اُس سے متفرق ہے۔ اُسے دین
کی قابلیت حاصل ہے۔ لیکن اُسے یہ اختیار بھی عطا ہوا
کہ خواہ وہ اپنے خالق کی واجب تعظیم کرے۔ خواہ نہ کرے
دین کی یہ قابلیت اُس کا اپنا خاصہ ہے کیونکہ اُ[...]
الٰہی نور ہے۔ اسی عنصر کی وجہ سے وہ خدا [...]
ہے۔ قرآن نے کسی جگہ صاف الفاظ میں

خدا نے انسان کو "اپنی صورت پر" خلق کیا - لیکن اس کتاب
کے شروع سے آخر تک یہ خیال پایا جاتا ہے اور اسی کی
وجہ سے وہ غیر فانی ہے - اُس کی سزا ابدی عذا
اُس کی خوشحالی خدا کے حضور ابد الآباد خوشحالی ہ